سفرنامہ

ہوا کے دوش پر

(زیارتِ ارضِ پاک اور سفرِ یورپ)

وقار مسعود خان

☆☆☆☆☆☆☆

نام کتاب ..... ہوا کے دوش پر

مصنف ..... وقار مسعود خان

تاریخِ سفر ..... جولائی 2001

انٹرنیٹ ایڈیشن ..... مارچ 2007

ترتیب وتزئین ..... عمار مسعود خان

اِن پیج کمپوزنگ ..... عمار مسعود خان

برائے رابطہ (مصنف)

6-D-W.....پیپلز کالونی۔خانیوال۔پاکستان

wakkar.masood@gmail.com

وقار مسعود خان کی زیرِ ترتیب کتب

افسانوں کا مجموعہ

مضامین کا مجموعہ (طنز ومزاح)

میرے والدین،
بھائی، بہن،
اور میری خوشی کی نذر

ہواؤں کے دوش پر اڑنا ہے مجھے
خوابوں میں کہیں اترنا ہے مجھے
تنکوں کی طرح بکھرنا ہے مجھے
جہان ایک نیا ڈھونڈنا ہے مجھے

ترتیبِ احوال

1۔چلو آغاز کرتے ہیں

2۔بلاعنوان

3 ۔دل دنیا اور دین

4 ۔رسولِ کریمؐ کا عظیم تحفہ

5 ۔سوئے مدینہ

6 ۔بعداز دیدار، طعام وقیام

7۔وہ جگہ ہمارے کس کام کی.....؟

8۔منزل بہ منزل (انگلستان کو روانگی)

9۔برمنگھم ایک گاؤں ہے

10 ۔آرٹ گیلری عطیہ پر چلتی ہے

11۔اپنی زبوں حالی پر ہم ناز کریں یا فکر

12۔مس جولی اور سٹی سینٹر

13۔برطانیہ میں بھی مخدوم پور

14۔برمنگھم میں مزید آوارگی

15۔ولیم تیرے دیس کے رنگ نرالے

16۔ایک سال پہلے کا ولیمہ

17۔پلے بال

18۔سردار جی کا شکریہ

19۔اصل سے نقل بہتر
20۔پہنچے ہم منزل پہ آخرش
21۔ابھی کچھ عزت باقی تھی
22۔ایک آزاد تفریح گاہ
23۔چند سکّوں کے عوض
24۔لندن کی گلیاں
25۔قصہ یہ حیرتوں کا، عالم یہ غیرتوں کا
26۔الوداع لندن الوداع
27۔کون؟.....ہم!.....کدھر؟.....پیرس!.....کب؟.....ابھی!
28۔میں مستنصر نہیں ہوں
29۔ہیلو!.....پیرس!.....
30۔اف یہ خطائیں، یہ سزائیں
31۔روٹھا ہوا پیرس
32۔پیرس کا ایک وسیع القلب میزبان
33۔جنگی قلعے سے جنگی یادگار تک
34۔پیرس دیکھ کر بھی نہ دیکھا
35۔یہ صرف اپنے وطن کا اثاثہ نہیں
36۔بھٹکے ہم پیرس میں

بسمِ اللہ الرّحمٰنِ الرّحیم.

چلو آغاز کرتے ہیں

ہم حکومتی ڈھانچے کے کوئی اہم رکن، کوئی سرکاری عہدے دار یا کسی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز نہ تھے کہ ہمیں سرکار یا ہماری کمپنی باہر کے دورے پر بھیجتی۔ اور نہ ہی ابھی تک عوام الناس کو ہمارے شاعرانہ و ادیبانہ قد کاٹھ کا اندازہ ہوا تھا کہ ہمیں کسی محفل میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا جاتا، تاہم ہماری قسمت میں ذرا سی آوارہ گردی لکھ دی گئی تھی سو ہمیں چند دنوں کے لئے کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوا، یا اِس طرح کہیے کہ آزادی نصیب ہوئی۔ جن ممالک کی سیاحت مقصود تھی، اُن کے ویزے کیسے حاصل کئے اِس موضوع پر شکووں، شکایتوں سے بھرپور ایک لمبی بحث کی جاسکتی ہے۔ انگلینڈ جسے انگلستان، برطانیہ، ولایت اور نجانے کیا کیا کہتے ہیں، اِس خدا ترس ملک کے سفارت خانے والے ایسے ''ممتحن'' واقع ہوئے ہیں کہ جب تک معصوم پاکستانیوں کو مہینوں چکر نہ لگوائیں، ویزہ عنایت نہیں کرتے۔ انگلستان کے علاوہ ہمیں فرانس اور سعودی عرب کے ویزے بھی درکار تھے۔ ویزوں وغیرہ کی یہ تمام ضروری کارروائی ہمارے سفر کے آغاز میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی طرح یہ ضروری کارروائی نبٹائی اور چند دنوں کی تیاری کے بعد ہم اب سفر کے لئے تیار تھے۔

ہمارے سفر کا آغاز قائدِ اعظم انٹرنیشنل ائرپورٹ کراچی سے ہوا۔ ائرپورٹ تک ہمیں ہمارے چچا مقصود خان صاحب الوداع کہنے آئے جو خود بھی پی آئی اے میں ایک افسر تھے اور اسی ائرپورٹ پر ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ نے ہماری کئی مشکلات آسان کر دیں۔ ہم سامان اٹھائے اپنی فلائٹ کے کاؤنٹر کی طرف چلے۔ بورڈنگ کارڈ، سیکورٹی اور دیگر معمول کی کارروائی کچھ شریفانہ تھی کیونکہ ابھی تک ''۱۱'' ستمبر (2001) المعروف نائن الیون اور پھر سات جولائی عرف سیون سیون (بمقام لندن) جیسے عبرت ناک حادثات وقوع پذیر نہ ہوئے تھے۔ دنیا میں کسی حد تک سکون کی رمق باقی تھی۔ پاکستانی سر اٹھا کر چل سکتا تھا اور کسی بھی ملک میں بآوازِ بلند کہہ سکتا تھا کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں یا یہی پاکستانی کسی بھی آوارہ گرد سیاح کی طرح اپنے سامان کے پیچھے ایک خوبصورت سا پاکستانی جھنڈا بنا کر اس کے نیچے جلی حروف میں اپنے پیارے پاکستان کا نام لکھ سکتا تھا۔ ہمارا یہ سفر ایک مہینے کی آوارہ گردی پر مشتمل تھا۔ ہمارے سفر کا آغاز چھبیس جولائی سے ہوا اور چھبیس اگست کو ہم واپس پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ایک مہینے بعد جب ہم واپس پاکستان پہنچے تو ٹھیک پندرہ دنوں بعد پاکستانیوں کے لئے یہ دنیا بدل چکی

تھی۔اور آئندہ ایک سال کے دوران ایسے واقعات رونما ہو چکے تھے جن کی وجہ سے پاکستانیوں اور مسلمانوں کا کسی بھی ملک کے ائرپورٹ سے بآسانی کلیئر ہو جانا ناممکن نظر آتا تھا۔غیروں کا شکوہ کیا کرنا، اپنے ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔لیکن ہمیں اس بات کی خوشی رہی کہ اللہ نے ہمارے سفر کو مناسب موقع پر ترتیب دیا۔ورنہ وہ من مرضی کی آوارگی جو ہم اس ایک مہینے میں یورپ وعرب میں کر چکے تھے، مہینے دو مہینے بعد کبھی اتنی آزادی سے نہ کر پاتے..... ہماری فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔پہلی منزل سعودی عرب کی سرزمین تھی۔جدہ ائرپورٹ پہنچ کر ہمیں عمرے کی ادائیگی کے لئے سیدھا مکہ پہنچنا تھا۔لہٰذا عمرے کی نیت کے ساتھ ساتھ احرام بھی ہمیں کراچی ائرپورٹ سے باندھنا تھا۔احرام باندھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔اسپیکر پر بار بار ہماری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا اور تیزی میں احرام باندھنا ہمارے لئے قدرے مشکل کا باعث بن رہا تھا۔جیسے تیسے کر کے ایک چادر کمر کے گرد اور دوسری دھوتی کے طور پر باندھی اور گرتے پڑتے جہاز کی طرف بھاگے۔

ہر چند کہ ہم ابنِ بطوطہ کی طرح کسی گدھے گھوڑے یا اونٹ پر سوار، معلوماتی کتابچوں بمع نقشہ جات اور سفر کے دوسرے قدیم ساز وسامان سے لیس نہ تھے مگر پھر بھی سعودیہ ائرلائن کے دیوہیکل ہوائی جہاز میں قدم رکھتے ہوئے ہم نے خود کو دل ہی دل میں ابنِ بطوطہ تصوّر کیا، خیالی طور پر لنگی کسی، داڑھی پر ہاتھ پھیرا، دستار چڑھائی، گھوڑے پر زین کسا، پانی کی چھاگل بھری اور سفر وحضر کے لئے تیار ہو گئے۔معاملہ یہ ہے کہ ہم اگر گھر سے بوٹے حلوائی کی دکان تک سوہن حلوہ بھی لینے جائیں تو باہر نکلنے سے پہلے خدا سے اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور مثلاً اگر بخیر وعافیت گھر کو واپسی ہو جائے تو پہلے گھر کی مقدس دہلیز پر ماتھا ٹیک کر اپنے مسکن سے محبت کا اعتراف کرتے ہیں۔اور پھر بادشاہوں کی طرح اپنے محل جیسے غریب خانے میں قدم رکھتے ہیں۔مگر اِس مرتبہ معاملہ پردیس کا تھا یعنی معاملہ نازک تھا۔ہماری منزل یعنی حسینہ پردیسی تھی۔امامِ ضامن بندھوانے کی رسم سے ہم ابھی تک واقف نہ ہوئے تھے ورنہ ضرور اِس ٹوٹکے کو آزماتے اِس لئے چاروناچار کردہ ناکردہ گناہوں کی توبہ کرنا پڑی، چوری چھپے سینے پر صلیب بنانے کا سوچا، اوم نمشوا کی گردان یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن ضمیر نے لعن طعن کرتے ہوئے کان کھینچے اور ہمیں راہ راست پر لا کھڑا کیا، پھر خدا کے حضور عقیدت واحترام سے دعا مانگی تو دلِ بے قرار میں ایسی شگفتگی کا احساس ہوا کہ ہم ہرن کی مانند قلانچیں بھرتے ہوئے اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔سعودیہ ائرلائن کو ہم نے اِس غرض سے شرفِ میزبانی بخشا کہ ہمیں خدائے وحدہ لاشریک کی رحمت کی بدولت عمرہ کی سعادت بھی حاصل کرنا تھی اور ہماری پہلی منزل سعودی عرب کی سرزمینِ پاک تھی۔جہاز نے وقت پر کراچی سے اڑان بھری۔آغاز میں تو ہوش قائم رہے لیکن گھنٹے بعد نیند نے غلبہ پا لیا لہٰذا باقی سفر کا ہوش نہ رہا۔صرف اتنا یاد رہا کہ کسی پری خیز چہرہ نے حسین مسکراہٹ کے ساتھ سفر کے دوران جگا کر کھانا پیش کیا اور جدہ ائرپورٹ پر جہاز سے اترتے ہوئے بھرپور انداز میں الوداع کیا۔میزبان ہمارے والد کے بے تکلف دوست ظفر صاحب تھے، وہ ائرپورٹ پر انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ضروری کارروائی کے بعد ہم باہر پہنچے تو انہوں نے والہانہ استقبال کیا۔یہاں سے ہمارا سعودی عرب کا سفر یادگار شروع ہو گیا۔

بلاعنوان

یہ نصیب کی بات تھی کہ ہمیں عمرے کی سعادت نصیب ہو رہی تھی اور عمرے کے بعد ہمیں آگے یورپ چلے جانا تھا۔عمرے کی غرض سے سعودیہ میں صرف چار دن کے قیام کا ویزہ مل سکا تھا۔مہینہ بھر یورپ میں آوارگی کے بعد لندن سے واپسی سعودیہ اور پھر یہیں سعودیہ سے دوسری فلائٹ پاکستان کے لئے لینی تھی۔اس لحاظ سے چار دن اس پاک سرزمین کی زیارت کے لئے بہت کم تھے۔لہٰذا تشنگی باقی رہی اور یہ سعادت پھر سے حاصل کرنے کے لئے ہم تا حال خدا سے دعا گو ہیں کہ آئندہ منزل صرف اور صرف سعودیہ ہی ہو۔دیکھئے خدا کب نافرمانوں کی دعا قبول فرمائے اور ایمانِ ناتواں کے حامل ہم جیسے گناہگاروں کی باری آئے۔

اب یہ چار دن سعودی عرب میں کیسے گذارنے تھے ان کا پروگرام بنانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔کیونکہ یہ ایسی سرزمین ہے جس تک پہنچنے کے لئے کوئی بھی مسلمان اپنی تمام زندگی انتظار کرتا رہتا ہے۔یہ ایسے مقامات ہیں جنہیں ساری زندگی تخیل کے پردوں اور تصویروں میں دیکھ دیکھ کر دل ان تک پہنچنے کے لئے حسرتوں،خواہشوں اور امنگوں کے جال بنتا رہتا ہے۔،اور اب ان جگہوں پر پہنچ کر انہیں چار دن میں کیونکر اور کیسے مکمل طور پر دیکھا جا سکتا تھا؟.....لہٰذا تمام زیارتیں بھاگم بھاگ اور صرف زبانی کلامی حاضری کی طور پر ہوئیں جس کا قلق تا حال دلِ نادان میں باقی ہے۔ان مقامات کی تعریف،ان جگہوں کے بارے میں ہمارے جذبات اور احساسات کس طرح چند ورقوں میں سما سکتے ہیں۔ظفر صاحب سے مشورہ کے بعد پروگرام کچھ اس طرح سے تیار ہوا کہ جدہ سے ہم آج ہی مکّہ روانہ ہونگے۔مکّہ میں عمرہ ادا کریں گے۔آج کی رات اور اگلا دن مکہ میں ہی گزارنے بعد رات گئے مدینہ کی طرف سفر کریں گے۔تیسرا دن مدینہ میں گزار کر اگلی صبح واپس جدہ لوٹیں گے اور پھر اپنے اس سفر کا اختتام شدید تشنگی کی حالت میں کریں گے۔

''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' کے مصداق ہماری پیاس بجھنی تو کیا تھی اور بڑھ گئی۔چار دن کا یہ قیام ایسے مقدس جام کی مانند تھا جس کو حلق میں انڈیلنے سے زبان اور حلق تو تر ہوتا تھا لیکن پیاس بڑھتی چلی جاتی تھی اور پھر سے حلق میں سوئیاں چبھنے لگتی تھیں ۔بہرِ طور ہم نے ظفر صاحب کی معیت میں ائرپورٹ کے باہر سعودیہ کی سرزمین پر قدم رکھا.....

باہر نکلے تو سورج آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔جولائی کا آخری ہفتہ تھا،گرمی زوروں پر تھی۔جیسے تیسے کر کے گاڑی میں سامان ٹھونسا اور اندر آ بیٹھے۔گاڑی میں بیٹھتے ہی ائرکنڈیشنڈ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بادِ صموم کی طرح خستہ حال بدن سے ٹکرائی تو پورے جسم میں تازگی کا احساس پھیل گیا۔ظفر صاحب نے سفر اور پاکستان کا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ائرپورٹ کے احاطے سے باہر نکلتے ہی انہوں نے گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔تھوڑی دیر بعد باقاعدہ شہر کے آثار نظر آنا شروع ہو

گئے۔جدہ شہر پہلی نظر میں ہمارے لئے ،پُرسکون ،مہذب ،صاف شفاف اور مہمانوں کو خوش آمدید کہنے والے شہر کے طور پر ابھر کر آیا۔تھوڑی دیر گزری تھی کہ باتوں ہی باتوں میں ظفر صاحب نے گاڑی سڑک کنارے روکی اور میزبانی کا فریضہ سرانجام دینے کی خاطر ایک اسٹور کے اندر خالی ہاتھ تشریف لے گئے۔پانچ دس منٹ بعد واپس لوٹے تو مشروبات ،چپس ،اور دیگر لوازمات سے بھرے ہوئے شاپروں میں لدے پھندے نظر آرہے تھے۔ان کے گاڑی سے اترتے ہی ہمیں ان کی اِس سازش کا بخوبی علم ہو چکا تھا اور اِس سازش پر عمل درآمد سے روکنے کے لئے ہم بھی ان کے ساتھ اسٹور میں جانا چاہتے تھے لیکن غالباً وہ ہمارا ارادہ بھانپ چکے تھے اس لئے سختی سے گاڑی میں بیٹھے رہنے کی ہدایت کر کے گئے۔ایک فرمانبردار مہمان کی طرح ہمیں چار و ناچار ان کا یہ حکم ماننا پڑا۔اب جو گاڑی میں داخل ہوئے تو شاپروں کو ہمارے حوالے کر دیا.....

بولے..... پانی پیو.....پیپسی پیو.....آئسکریم لو.....بسکٹ چکھو.....ایک ہی بار میں یہ سب کام کرنا کسی حد تک ناممکن لگا تو ہم نے ان سے تھوڑی سی رعایت برتنے کی درخواست کی جو ایک عدد شرارتی سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لی گئی۔بیس پچیس منٹ کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد ہم ایک خوبصورت رہائشی علاقے میں پہنچے جہاں ہر طرف تین چار منزلہ عمارات بنی ہوئی تھیں۔انہیں میں سے ایک سفید رنگ کی عمارت کے سامنے ظفر صاحب نے گاڑی لا کھڑی کی۔ان کا فلیٹ پہلی منزل پر واقع تھا۔ان کی اہلیہ کے ہمراہ انکی بہو اور بہو کی گود میں ایک عدد خوبصورت سی گول مٹول بچی نے ہمارا استقبال کیا۔تھوڑی دیر تک مہمان خانے میں بیٹھ کر باتیں ہوتی رہی ،ستاتے رہے۔پاکستان سے انکی جو امانتیں اور چیزیں لائے تھے ،انکے حوالے کیں۔پھر تازہ دم ہونے کے لئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ہم نے غسل کا فریضہ پاکستان میں ہی آغازِ سفر سے پہلے سرانجام دیا تھا۔اور عمرہ کی نیت کے ساتھ احرام جلدی جلدی کراچی ائرپورٹ پر باندھا تھا کیونکہ جہاز میں مسافروں کے پہنچنے کا اعلان ہو چکا تھا اور ہم آخری مسافروں میں سے تھے۔اب یہاں نہا دھو کر ایک دفعہ پھر سے غسل کیا اور احرام باندھا ،اس وقت تک کھانا میز پر چن دیا گیا تھا۔انہوں نے تمام تر لوازمات سے مزین نہایت ہی پرتکلف دعوت کا اہتمام کر ڈالا تھا۔کھانے سے پورا پورا انصاف کرنے کے دوران کھانے کی لذت کا ذکر کرنا بھی ہمارا فرض بنتا تھا لہٰذا کھانا کھانے اور تعریف کرنے دونوں کا پلڑا برابر رکھا۔کھانے سے فارغ ہوئے تو ظہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ہم نماز کے لئے ظفر صاحب کے ساتھ قریبی مسجد چلے گئے۔بے حد کشادہ اور خوبصورت مسجد تھی۔پاکستان میں مغرب کے رخ نماز پڑھنے کی عادت تھی لیکن اس مسجد میں کعبہ شاید مشرق یا جنوب کی جانب بنتا تھا۔امامِ مسجد عربی النسل تھا۔جماعت ختم ہو جانے کے بعد سب نمازیوں نے اپنی اپنی دعا مانگی۔نمازیوں میں عربی ،ایشیائی اور مختلف رنگ و نسل کے افراد شامل تھے۔غالباً سفید رنگ کی اس مسجد میں جا بجا قرآن مجید قرینے سے رکھے تھے۔نماز سے پہلے اور بعد میں بھی کئی افراد قرآن کی تلاوت کرتے نظر آئے۔مسجد میں خوبصورت قالین بچھے تھے اور روشنی کا بہترین انتظام تھا۔نماز کے بعد ہم واپس گھر پہنچے اور گپ شپ کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع ہوا۔پاکستان ،سعودی عرب ،ملتان ،خانیوال ،ہر جگہ کے

بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ظفر صاحب ہمیں عمرے اور زیارات کے حوالے سے مکّہ و مدینہ کی اہم اور خاص باتیں بتاتے رہے۔عصر کی نماز بھی مسجد میں ادا کی۔نماز کے بعد ہم نے مکہ روانگی کے لئے تیاری شروع کی اور ظفر صاحب کے ہمراہ مکّہ کی راہ لی۔گاڑی شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ہائی وے (یا موٹروے) پر چڑھ آئی۔درمیان میں کہیں ایک کثیر منزلہ عمارت دکھائی دی تو ظفر صاحب نے بتایا کہ یہیں وہ بحیثیت اکاؤنٹنٹ جاب کرتے ہیں۔گاڑی اب صاف ستھری شاہراہ پر نفاست کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔راستے میں ایک جگہ مخالف سڑک پر کسی گاڑی کے اردگرد پولیس اور ایمبولینس کھڑی دیکھی.....غالباً کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور شاید اس حادثے میں کچھ اموات بھی ہوئی تھیں کیونکہ ایک دو اجسام سفید چادروں سے ڈھانپے ہوئے سڑک پر رکھے نظر آرہے تھے۔ہم نے توبہ تائب ہوتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے اپنی سلامتی کی دعا مانگی اور سفر جاری رکھا کہ اے اللہ ہمیں بخیر و عافیت اپنے در تک پہنچا دے اس کے بعد یہ جان تیرے حوالے کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کریں گے۔مکّہ سے تھوڑی دیر پہلے ایک پڑاؤ آتا ہے۔اس جگہ کو میقات کہا جاتا ہے جہاں سے لوگ عمرے کی نیت کرتے ہیں اور احرام باندھتے ہیں۔یہاں ایک مسجد بھی ہے۔ہم نے چونکہ کراچی ائرپورٹ سے ہی عمرے کی نیت کے ساتھ احرام باندھ لیا تھا.....لہذا یہاں مسجد میں صرف نمازِ مغرب کے لئے رک گئے۔ابھی نماز ادا کر کے باہر گاڑی کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ظفر صاحب موصوف ایک مرتبہ پھر سپر اسٹور سے نکلتے ہوئے دکھائی دیئے۔سابقہ ریکارڈ برقرار رکھتے ہوئے اس مرتبہ بھی وہ ان گنت تھیلے اٹھائے چلے آرہے تھے جن میں بھانت بھانت کی چیزیں نظر آرہی تھیں۔شاید ایک مرتبہ پھر سے احساسِ میزبانی نے ان کے دل میں جوش مارا تھا اور اس لہر کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ سپر اسٹور میں گھس گئے تھے۔سعودی عرب کا موسم چونکہ نہایت گرم ہوتا ہے، گاڑی میں ائرکنڈیشنڈ آن کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا، اس لئے گرمی کا اثر زائل کرنے کے لئے ٹھنڈے مشروبات اور پانی ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ایک مرتبہ پھر مکّہ کی طرف سفر شروع ہو گیا۔مکّہ کی حدود شروع ہونے سے پہلے ایک چیک پوسٹ آتی ہے جہاں تمام مسافروں کے کاغذات چیک کئے جاتے ہیں۔غیر مسلموں کو مکّہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔اس لئے اس مقدس شہر میں غیر مسلموں کے ناپاک قدم نہیں پہنچ پاتے۔چیک پوسٹ سے ہی دائیں جانب ایک سڑک طائف کی طرف نکل جاتی ہے۔چیک پوسٹ پر پہنچے تو روٹین کے مطابق اپنے کاغذات اہلکاروں کو تھما دیئے۔

عجب حالِ دل تھا.....

ایک گنہگار انسان اپنے خالق کی عنایت کی بدولت اُس کے گھر کا دیدار کرنے چلا تھا.....جس دل پر عرصہ دراز سے شیطانی تالے پڑ چکے تھے.....اُس دل کے لئے آج خدا کے گھر کے تالے کھل رہے تھے.....رحمتوں کے در وا ہونے والے تھے.....کالے سیاہ دل کے مالک خود غرض انسان کو کو حرم پاک کی زیارت نصیب ہونے والی تھی.....قائداعظم ائرپورٹ پر سفر سے روانگی سے پہلے ہی دل میں ایک عجیب سی گدگدی ہو رہی تھی کہ اپنے سوہنے رب پاک کے گھر جا رہے ہیں۔

کالی کملی والے کے در پر حاضری دینے کا سفر شروع ہوا چاہتا ہے.....

اصل زندگی شروع ہوئی چاہتی ہے.....

جیون کی ابتدا ہونے کو ہے.....

کتنے ہی شگفتہ شگفتہ خیالات تازہ کھِلے غنچوں کی طرح دل میں اتر رہے تھے۔آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر دل چنچل پن پر اترا ہوا تھا۔جیسے کوئی عاشق برسوں اپنے محبوب سے غائبانہ طور پر ہمکلام رہا ہو اور فضاؤں میں،خوابوں خیالوں میں اپنے محبوب کا عکس دیکھتا رہا ہو اور اب اچانک اسے اپنے محبوب کی زیارت اور درشن کی اجازت مل گئی ہو اور بے قابو دل کو تھامتے ہوئے،لرزتے کپکپاتے قدموں کے ساتھ وہ اپنے محبوب کے گھر کی طرف چل رہا ہو اور لمحہ لمحہ اس پر صدیوں کی طرح بھاری ہو جائے.....وہ دل و دماغ میں چل رہی اس سحر انگیز کشمکش کو بھی جاری رکھنا چاہتا ہو لیکن جلد سے جلد اپنے محبوب کی پرچھائیوں میں بھی پہنچنا چاہتا ہو اور یہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ آیا وہ بیقرار کر دینے والے اس سفر کو جاری رکھے یا بڑے بڑے قدم اٹھا کر دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جلد از جلد اپنے محبوب کے ٹھکانے پر پہنچ جائے.....لہٰذا حرم پاک کا دیدار کرنے کا خیال پورے بدن میں سرور بن کر دوڑ رہا تھا۔جسم کا رُواں رُواں شدتِ جذبات سے معمور تھا.....خیالوں میں ایک انوکھی طرز کی اُٹھان تھی.....جلد از جلد منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کی خواہش تھی.....دل چاہتا تھا کہ وقت پر لگا کر اڑ جائے.....ہوا اپنی نرم و گرم آغوش میں اٹھا کر ہمیں خانہ کعبہ کی چھاؤں میں لا کھڑا کرے۔انتظار کے طویل لمحات دل کی بے قراری میں اضافہ کر رہے تھے۔اور اب وہ خوش نصیب گھڑی آن پہنچی تھی کہ ہم صرف اور صرف اپنے پیارے نبی پاکؐ کے امتی ہونے کے ناطے ،صرف اور صرف اپنے پیارے رسولؐ کی شفاعت کی بدولت اس عظیم شہر میں داخل ہو رہے تھے۔کاغذات کی چیکنگ کے بعد گاڑی دھیمی سی رفتار کے ساتھ مکّہ شہر کی طرف بڑھنے لگی۔گزرنے والا ایک ایک لمحہ دھڑکنوں کی شدت میں اضافہ کرتا چلا گیا.....بے چینی و بے قراری تھی کہ لہو بن کر بپھری ہوئی لہروں کی طرح بدن میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔دل میں اس قدر چاشنی جمع تھی کہ اچھل اچھل کر حلق میں آتی تھی۔بدن پہ ہلکی سی کپکپی طاری تھی۔لبوں پہ لرزش تھی۔نظریں پتھر بن کر سامنے کو جمی تھیں کہ ابھی خانہ کعبہ پر نظر پڑے گی.....

ابھی زندگی پل بھر میں خود کو بدلے گی.....

ابھی جیون کی خوش نصیب ترین گھڑی آئے گی.....

دل دھڑکنا بھول جائے گا.....

ابھی آنکھیں جھپکنا چھوڑ دیں گی.....

دل اللہ پاک کی عقیدت و محبت سے سرشار ہو کر اللہ ہو اللہ ہو پکار اٹھے گا.....

ابھی بدن کا انگ انگ اللہ اکبر کی صدا بلند کرے گا.....

ابھی ہونٹوں سے زندگی کی سب سے بڑی دعا نکلے گی.....

وہ مقدس لمحہ، وہ عظیم گھڑی، وہ خوش نصیب ساعت، وہ پرشکوہ منظر جیسے ہی نظروں کے سامنے آیا..... بندہ اردگرد سے بے نیاز ہو گیا۔ کعبے کے کالے غلاف کا منظر تھا اور ہم تھے.....ا

ردگرد کچھ بھی نہ تھا.....

خلاء تھا.....

اندھیرا تھا.....

دور دور تک کچھ بھی نہ تھا.....

ہاں!.....

ایک لمبی اور سنہری روشن لکیر تھی جو ہمیں اس گھر تک پہنچانے والی تھی.....آنکھیں اس منظر کی تاب نہ لا کر خیرہ ہو گئیں۔ زبان سے لفظ ادا کرنا مشکل ہو گئے۔ فرطِ جذبات سے آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اشتیاق اپنی حدوں کو چھونے لگا.....ہم نے دل ہی دل میں اپنی زندگی کی عزیز ترین دعا مانگی۔ وقت کے خزانے سے وہ ایک ساعت ہم نے اپنی ملکیت بنا لی.....صرف اور صرف اپنی ملکیت.....وہ گھڑی ہم نے وقت سے چھین لی.....جھپٹ لی.....کسی بھوکے، پیاسے، بے حال اور بدمست شخص کی طرح وقت کے بے رحم اور کھردرے ہاتھوں سے وہ گھڑی ہم نے جھپٹ کر اپنی آنکھوں، اپنے دل میں محفوظ کر لی۔ وہ لمحہ اپنی زندگی کا حاصل بنا لیا۔ شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف گہما گہمی نظر آئی۔ ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ بدن سے مادہ غائب ہو چکا تھا صرف روح ہی روح باقی تھی۔ دل کا بوجھل پن ڈھہہ چکا تھا اور خود میں نہایت ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا اس لئے شہر میں روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ ویسے بھی مکہ میں رات اور دن کا فرق ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پورا شہر رات بھر جگمگ کرتی روشنیوں سے رونق رہتا ہے۔ مسجد الحرام کے اردگرد زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ سینکڑوں لوگ مسجد کے اندر باہر آ جا رہے ہوتے ہیں۔ رات کا کوئی پہر ایسا نہیں پڑتا جب مسجد کا کوئی حصہ خالی نظر آئے یا اندھیرے میں ڈوب جائے۔ مختلف رنگ و نسل کے سینکڑوں لوگ عبادات، نوافل، ذکر و اذکار، طواف اور تلاوتِ قرآن پاک میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں۔۔ دن بھر مزدوری کرنے والے پردیسی رات کو دل جمعی سے طواف کرنے آتے ہیں اور اپنی پریشانیاں اللہ تعالیٰ سے شیئر کر لینے کے بعد سکون محسوس کرتے ہیں۔ مسجد کے باہر بنے ہوئے چھوٹے سے لاری اڈے پر ہر وقت مدینہ اور طائف کے لئے بسیں موجود رہتی ہیں۔ خوانچہ فروش، کھجوریں، انگور اور دیگر اشیاء بیچنے والے مسلسل آوازیں لگاتے رہتے ہیں۔ ہر آدھے گھنٹے بعد مدینہ کے لئے بسیں روانہ ہوتی ہیں۔ سڑک کنارے بنے ہوئے حمام اور دوسری دوکانیں زائرین کے لئے ہمہ وقت کھلی رہتی ہیں۔ ہر

طرف رونق کا سماں ہوتا ہے۔وضوخانے میں پانی گرنے آواز جاری رہتی ہے اورلوگ صفاومروہ کے درمیان سعی کرتے رہتے ہیں۔جولوگ عمرہ ادا کرنے کے بعدحمام سے سرصاف کروانا پسندنہ کریں،وہ وہیں صفاومروہ کی پہاڑیوں پر کھڑے ہوکرسعی کے آخرمیں قینچیوں یااسترے سے ایک دوسرے کے بال کاٹتے نظرآتے ہیں۔اوراپنے ترشے ہوئے بال کسی شاپر میں جمع کرلیتے ہیں۔مقامِ طواف سے ذرافاصلے پرزیرِ زمین بنے زمزم کے کنویں کے اردگرد پیاس بجھانے والوں اور پانی بھرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔دن کے بارہ بج رہے ہوں یارات کا ایک،مقام ابراہیمی،رکنِ یمانی،اورخاص الخاص حجرِ اسودکو چومنے والے مسلسل دھکم پیل میں مصروف رہتے ہیں۔شاذونادرکسی عورت کومردوں کے دھکوں کے درمیان یاسیکورٹی پر ماموراہلکاروں کی تنبیہہ کے بعدحجرِ اسودکو چومنے کی سعادت بھی نصیب ہوجاتی ہے۔کسی نماز کی اذان سنائی دے تولوگ سب کام چھوڑکر ہزاروں کی تعداد میں مسجدِ کی طرف چلے آتے ہیں۔بلکہ گشت کرنے والے سپاہی ڈانٹ ڈپٹ کرسب کومسجد کی طرف بھیجتے ہیں.....کاروبارتھوڑی دیر کے لئے ساکت ہوجاتا ہےاورنماز کے بعدوقت کا پہیہ پھرسے گھومنے لگ جاتا ہے۔ایک بھرپور زندگی ہے جو چوبیس گھنٹےمسجدالحرام کے اندراور باہردیکھی جاسکتی ہے۔انسان لاشعوری طور پریہیں جینے اوریہیں مرجانے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

مکہ میں ہمارے میزبان میاں اکرم تھے۔اکرم میاں نے ایک تین منزلہ مکان حاصل کررکھا تھا جہاں ان کے ساتھ ساتھ ہمارے شہر''مخدومپور'' خانیوال کے دوسرے افرادبھی رہائش پذیر تھے۔ان کامکان مسجدالحرام کے سامنے پہاڑی پربسی ہوئی آبادی کے درمیان واقع تھا۔انتہائی بلندی پر واقع مکان تک بذریعہ سڑک،یاسانپ کی طرح بل کھاتی،چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی میڑھی گلیوں کے ذریعے پہنچنا پڑتا تھا۔۔اکرم صاحب کے ہاں پہنچ کرظفرصاحب کچھ دیر بیٹھے رہےلیکن انہیں ہرصورت آج ہی واپس جدہ پہنچنا تھالہٰذاسب کے بے حداصرار کے باوجودوہ واپسی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ہم نے بہت روکنا چاہالیکن ہمارے تمام حربوں کونا کام بناتے ہوئے انہوں نے الوداعی ملاقات کی اورواپسی کی راہ لی۔اب ہم مکمل طور پراکرم صاحب کے رحم وکرم پر تھے.....ان کی میزبانی کچھ ایسی بری بھی نہ تھی۔نہایت مہمان نوازاوروضع دارانسان ثابت ہوئے۔جدہ سے مکّہ تک کچھ زیادہ سفرنہ تھا پھربھی کچھ دیرلیٹ کرآرام کیا،باتیں کرتے رہے اوراب ارادہ فوراً حرم شریف پہنچنے کا تھا۔لیکن قیام وطعام اورمہمانداری ومیزبانی جیسے تمام تکلفات ہمارے خانہ کعبہ تک پہنچنے والے راستے میں حائل ہورہے تھے۔یہی دیرروح کوایک ایسے بیش قیمت انتظار سے روشناس کروارہی تھی جس میں سکون ہی سکون تھا.....سرور ہی سرور تھا.....لذت تھی.....اطمینان تھا۔ایسا انتظارجس کا ہرلمحہ رسیلا تھا۔وضوکرکے اکرم صاحب کی رہنمائی میں پیدل ہی گھر سے نکلے۔حرم شریف تک پہنچنے کے لئے ان گنت ٹیڑھی میڑھی اوربل کھاتی گلیوں سے گزرنا پڑااوربیسیوں سیڑھیاں اترنی پڑیں۔ان تمام گلیوں کی عام بات تودائیں بائیں بنے ہوئے پرانے مکانات تھے۔لیکن خاص بات وہ رنگ برنگی موٹی تازی دندناتی ہوئی بلیاں تھیں جوگلی کے ہر کونے

کھدرے میں نہایت دلیری سے ٹہلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ دو دو، تین تین کے گروپ میں یہ شرارتی اور بہادر بلیاں اپنے آنگن کی ملکاؤں کی طرح گلیوں میں راج کرتی بھلی محسوس ہوتی تھیں۔ دس پندرہ منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم مسجد الحرام کے سامنے والی سڑک پر پہنچ گئے۔

ایک عجیب سی کشمکش تھی.....ایک دل چاہتا تھا کہ چند قدموں کا یہ فاصلہ صدیوں پر محیط ہو جائے اور ہم اسی ذوق وشوق کے ساتھ خانہ کعبہ کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے رہیں۔ پھر دل چاہتا تھا کہ یہ فاصلے آنِ واحد میں سمٹ جائیں اور ہم خانہ کعبہ کے کالے غلاف کی آغوش میں جا لپٹیں۔ قدم بھاری ہوئے جا رہے تھے۔ خواہشوں اور جذبوں کا ایک بے لگام دھارا تھا جو ہمیں دھیرے دھیرے حرم شریف کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اندر داخل ہونے سے قبل جوتیاں اور ذاتی سامان محفوظ کیا.....لوگ بھیڑ کی شکل میں مسجد میں داخل ہو رہے تھے اور ان گنت جوتیاں اور سامان لاوارث پھیلا ہوا تھا.....ہم نے بابِ عمر (یا بابِ عمرہ) کے ذریعے مسجد الحرام میں قدم رکھا۔ اپنی زندگی کا مقدس ترین سفر شروع کیا۔ اپنے جیون کا کامیاب ترین، خوش قسمت ترین قدم اٹھایا.....آگے بڑھے۔ عشاء کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ابھی خدا کو ہمیں اور انتظار کروانا مقصود تھا۔ ابھی اس انتظار میں اور تپا کر کندن کرنا مقصود تھا کیونکہ نماز کے لئے جماعت کھڑی ہو رہی تھی اور ہم کعبہ کے سامنے جا کر، اس کے نزدیک پہنچ کر بھی اس سے دور تھے۔ آنکھوں میں عکس تھا اور دل میں روشنی.....لبوں پہ صرف نامِ خدا کی چاشنی.....پچھلی صفوں میں کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ سنتیں اور وتر مکمل کرنے کے بعد کتنی ہی دعائیں مانگیں۔ اور پھر بے قراری کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف لپکے کہ یہ ساعت کہیں گزر ہی نہ جائے.....یہ سعادت کہیں لمحہ بھر میں چھین ہی نہ لی جائے.....حلق آنسوؤں سے تر ہو گیا.....دل اچھل کر حلق میں آ گیا.....جذبات کی شدت سے بدن آگ کی طرح تپنے لگا.....انگ انگ جوش و جذبے سے لبریز ہو کر حرارت چھوڑنے لگا.....ہم جیسے گنہگار انسان نے بالآخر خانہ کعبہ کے غلاف کو چھو لیا تھا.....یہ سعادت ایک گنہگار کو نجانے کس نیکی کے عوض عطا کر دی گئی تھی۔ اِس خوش نصیب لمحے پر نفاست کے ساتھ، عقیدت و احترام سے آنسوؤں کا غلاف چڑھایا.....بوسوں کی گرہ باندھی اور پھر چپکے سے دل کے ایک کونے میں محفوظ کر لیا۔ کتنی ہی دیر خانہ کعبہ سے چمٹ کر کھڑے رہے۔

حواس کہاں تھے.....

ہوش کدھر تھا.....

کعبے کا غلاف تھا اور نم آنکھیں تھیں.....

ان گنت خطاؤں کی معافیاں تھیں اور رب سے باتیں تھیں.....

بھڑ بھڑاتے لب.....

اشک، کپکپاتے ہاتھ اور لرزتا بدن تھا.....
نور کی بارشیں تھیں.....

خدا تھا اور بندۂ خدا تھا.....

گذشتہ زندگی کا ایک ایک سیاہ پل آنکھوں کے سامنے آنے لگا۔ پشیمانی اور پچھتاوا پورے زور وشور کے ساتھ آن وارد ہوا۔ اپنے گناہوں کو یاد کرتے گئے اور اُس عظیم ہستی سے مانگتے گئے۔ وہ نوازتا چلا گیا.....دیتا چلا گیا۔ پھر آدھا چکر کاٹ کر حجرِ اسود کے سامنے پہنچے۔ زبان سے خدائے وحدہ لاشریک کی تعریف وتوصیف جاری تھی۔ دل اپنے خالق کے روبرو تھا۔ حجرِ اسود کے گرد عاشقین کا ایک ہجوم نظر آرہا تھا۔ بوسہ دینے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا لہٰذا طواف شروع کیا۔ طواف کی ابتدا حجرِ اسود ہی سے کی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہی۔ دل کی سیاہی مٹتی گئی۔ یہ خاکی بدن اللہ پاک کی مہربانی کی بدولت روشنیوں میں نہاتا چلا گیا۔ نور کے ہالے اردگرد رقص کرنے لگے۔ طواف کے سات چکروں کے دوران دومرتبہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل کی۔ جس پتھر کو ہمارے آقاؐ نے بوسہ دیا تھا، یوں لگا اسے چوم کر ہم نے بصد عقیدت واحترام اپنے آقاؐ کو بوسہ دیا.....کعبہ کے غلاف سے بار بار چمٹ کر کھڑے رہے اور زندگی کے داغ دھوتے رہے۔ دل چاہتا تھا ماضی کو اس طرح سے فراموش کر دیا جائے جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ اپنی کاپی پر کچی پنسل سے ایک تصویر بناتا ہے اور پھر اس تصویر میں کوئی نقص دیکھ کر اسے ربڑ سے مٹا دیتا ہے.....پھر تصویر بناتا ہے اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ کاپی اٹھائے تصویر دکھانے کے لئے اپنے بڑوں کی طرف بڑھتا ہے.....''بڑے'' اس بچے کی بنائی گئی تصویر دیکھتے ہیں اور جہاں جہاں کچھ غلطی محسوس کرتے ہیں..... پیار سے بچے کو سمجھاتے ہوئے تصویر کا وہ بھدا حصہ ربڑ سے مٹاتے ہیں اور اس حصے پر درستگی سے خط کھینچتے ہیں.....بچہ پھر سے کورا کاغذ لے کر بیٹھ جاتا ہے ایک نئی، صاف ستھری اور اچھی تصویر بنانے کے لئے.....اور پھر وہ پہلے سے بھی اچھی تصویر بناتا ہے.....ایسے ہی دل چاہتا تھا کہ پچھلی زندگی کا نشان تک مٹ جائے۔ حطیم قوس کی شکل کی وہ نامکمل دیوار ہے جو بابِ عمر سے مسجدالحرام میں داخل ہوتے ہی خانہ کعبہ کے بائیں طرف نظر آتی ہے۔ حطیم خانہ کعبہ کا ہی حصہ شمار کیا جاتا ہے، یہاں نوافل ادا کئے، رکن یمانی کو بوسہ دیا، مقامِ ابراہیمی پر دعائیں پڑھیں۔ مستی میں ڈوب کر لبیک اللھما لبیک کا ورد کیا۔ خانہ کعبہ کے پرنالہ کے نیچے کھڑے ہو کر اُس گھر کے مالک سے زندگی سنوار دینے کی التجا کی۔ خانہ کعبہ سے چند قدم کے فاصلے پر زمین دوز کمروں میں زم زم کا کنواں اور وضو کی جگہ بنی ہے۔ وہاں جا کر آب زم زم سے لب تر کئے۔ پھر سعی کے لئے صفا ومروہ کی طرف گئے۔ صفا ومروہ کسی زمانے میں پہاڑیاں رہی ہونگی لیکن اب صرف سخت پتھر کی دو ڈھیریاں باقی ہیں۔ سعی کے سات چکروں کے دوران خدا کے خزانے سے اپنے لئے تھوڑی سی نعمتیں مانگیں۔ اس کی رحمت مانگی.....نعمت مانگی.....اس کا رحم وکرم مانگا۔ سعی کے بعد بال کٹوانے کا رکن باقی تھا۔ لوگ وہیں کھڑے کھڑے قینچی اور مشینوں سے بال کاٹنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ ہم نے مسجدالحرام سے باہر سڑک

کنارے بنی ہوئی دکانوں میں سے ایک حمام سے بال کٹوائے۔عمرہ کا یہ رکن مکمل ہوا تو ہم ایک عدد صاف شفاف ''ٹنڈ'' کے مالک بن چکے تھے۔ہم نے اس حسین وجمیل تبدیلی کو صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان جاری اس عمل سے تشبیہہ دی کہ ''بندہ ''خدا کے گھر حاضری دینے کے بعد بالکل اس معصوم بچے کی مانند ہو جاتا ہے جو ابھی ابھی ماں کے پیٹ سے نکلا ہو۔معصومیت کا تو فی الحال گمان نہ ہو سکا لیکن ٹنڈ جیسا مکمل اور جیتا جاگتا ثبوت دیکھ کر دل کو کچھ اطمینان حاصل ہوا۔اس موقع کے لئے ایک ٹوپی کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا لہٰذا اسے ہی سر پر سجا کر حسن کو پردہ دار بنایا۔جن گلیوں سے نیچے آئے تھے۔بازار میں گھوم پھر لینے کے بعد انہیں گلیوں کے ذریعے اوپر گھر تک پہنچے۔اکرم صاحب نے رات کا کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کر رکھا تھا۔ان کے بیوی بچے چونکہ پاکستان میں ہوتے ہیں۔اس لئے ہوٹلوں میں کھانے کی بجائے وہ خود ہی کھانے پکانے کے ماہر بن چکے ہیں۔بے حد لذیذ اور ذائقے دار کھانا تھا۔کھانے پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد گپ شپ کا ایک طویل ترین سلسہ سعودی عرب سے شروع ہو کر ہمارے گاؤں مخدوم پور ''خانیوال'' تک جا پہنچا۔اور پھر رات گئے نیند کی دیوی نے چپکے سے آ کر ہمارے ذہن میں نقب لگائی اور ہمیں بڑے سکون کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیا۔

.....

دل دنیا اور دین

اللہ تعالیٰ کسی بھی مسلمان کو اپنی مقدس سرزمین کی زیارت کی سعادت اپنی رضا سے عطا کرتا ہے۔ ہمیں خدا نے یہ سعادت کم عمری میں ہی عطا کر دی۔ یہ زندگی کا سب سے خوبصورت موڑ تھا۔ شہنشاہِ کائنات کی طرف سے اجازت دے دی گئی تھی کہ اس کے دربار میں حاضری دیں اور سربسجود ہو کر اپنی غلطیوں کا صدقِ دل سے اعتراف کریں..... سجدہ ریز ہو کر اس کی وحدانیت کا صدقِ دل سے اقرار کریں اور من کی مراد پائیں۔ لیکن قسمت نے چال ایسی چلی تھی کہ حرم پاک و سبز گنبد کی زیارت کی سعادت بھی مل جائے اور تشنگی باقی رہنے کی بجائے مزید بڑھ جائے، ان مسحور کن لمحات سے لطف اٹھانے کے لئے ہمارے پاس لمحات بہت کم تھے یعنی دن کے صرف پانچ سے چھ گھنٹے..... جن میں ہم نے مکہ کی تمام زیارات پر حاضری دینی تھی۔ بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں رکنے کو دل چاہتا تھا جنہیں دور سے دیکھ لینے اور آنکھوں سے چوم لینے کی بجائے وہاں تک اپنے قدموں کے ذریعے پہنچ جانے کو جی کرتا تھا اور اتنے مختصر وقت میں ایسا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ شام کو مدینہ کے لئے روانگی طے ہو چکی تھی۔ اکرم صاحب نے حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے خلوصِ دل اور نہایت محبت کے ساتھ ہماری رہنمائی کی۔ یہ ان کی مہارت تھی کہ اتنے مختصر وقت میں انہوں نے ذاتی گاڑی کے ذریعے ہمیں زیادہ سے زیادہ جگہوں کی زیارت کروائی۔ احوال کچھ اس طرح سے ہیں.....

رات کو دیر سے سوئے جس کے نتیجے میں صبح دیر سے آنکھ کھلی، ناشتہ حسبِ حال نہایت خوش ذائقہ اور پر تکلف اکرم صاحب کے ہاتھوں تیار کیا تھا۔ گیارہ بجے کا وقت تھا جب ہم زیارتوں کے لئے روانہ ہوئے۔ بار بار احساس ہوتا تھا کہ ایسی سعادت اور سفر کے لئے چار دن کسی بھی طرح مناسب نہ تھے۔ اکرم صاحب نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کے احاطے میں اور مسجد الحرام کے ارد گرد کی اہم جگہوں کی زیارت کروائی۔ گذشتہ رات مسجد کی صحیح طرح سے زیارت نہ کر سکے تھے لہٰذا جی بھر کر مسجد میں وقت گزارا۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ نوافل اور قضا نمازیں ادا کیں۔ مسجد میں جا بجا کئی ممالک کے باشندے نظر آتے تھے۔ لوگ تلاوتِ کلام، تسبیحوں، نفلوں اور طواف میں مصروف دکھائی دیتے تھے..... ہر کوئی اپنے اپنے حصے کی سعادت سمیٹ رہا تھا..... جھولی پھیلانے والے جھولی بھر بھر کے تھک جاتے تھے اور واپس چلے جاتے تھے لیکن جھولی بھرنے والا جھولی بھرتا چلا جاتا تھا..... لمحہ بھر میں ذہن زمانۂ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا.....

یہی وہ مقام ہے جہاں آدم و ابراہیمؑ نے چند کچی اینٹوں کے ذریعے خدا کے گھر کی بنیاد رکھی..... بعد میں اسی جگہ بتوں کی پرستش کی گئی..... اسی احاطے میں مشرکوں نے خدا کے مقابلے میں پتھر کے خداؤں کو تعمیر کیا..... یہیں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن

جنگ ہوئی.....یہیں بڑے بڑے مسائل کے فیصلے کئے گئے.....اسی مقام کو باطل قوتیں بھی مقدس گردانتی تھیں اور یہی مقام مسلمانوں کے لئے بھی مقدس ترین تھی.....اس جگہ نے ہزاروں سالوں میں کیسے کیسے زمانے دیکھے.....اسی خاک پر کس کس طرح خدا کے مقابلے پر نا خداؤں کی پوجا کی گئی.....زمین کے اسی خطے کو ڈھانے کے لئے زمانوں بھر کے سورماؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا.....کفار، یہود و نصاریٰ نے سازشوں کے جال پھیلائے.....اور آج تک یہ جگہ غیر مسلموں کے دل میں کیل کی طرح چبھتی ہے.....لیکن اُس ذاتِ اکبر خدائے وحدہ لاشریک نے اپنی مقدس کتاب اور اپنے گھر کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے جو ہاتھیوں کی فوج کو ننھے پرندوں کے ذریعے بھسم کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ جو ناپاک عزائم سے لیس دلوں کو پھاڑ دینے کی قوت رکھتا ہے.....جو غائب و حاضر کے تمام معاملوں پر قدرت رکھتا ہے.....جو باطل کو سلجھنے کے لئے ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے اور پھر جب وہ انسانیت اور وحدانیت کے لئے خطرناک ہو جاتے ہیں تو انہیں رہتی دنیا تک عبرت کا نشان بنا دیتا ہے.....اور ہم پر اس پاک ذات کا کرم ہے کہ ہمیں امتحانوں سے بچایا اور ایک مسلمان گھرانے میں پیدا کیا.....اور بالآخر ہمیں لوٹ کر واپس اسی کے روبرو حاضر ہونا ہے.....

مسجد الحرام کے بعد شہر کی طرف نکلے.....کچھ دیر بعد اکرم صاحب نے گاڑی غارِ حرا والے پہاڑی سلسلے کی طرف موڑ دی۔ سورج پھر سے سر پر آن پہنچا تھا اور گرمی شدت کی تھی.....لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف نظر آتے تھے.....مکہ میں ٹریفک کا رش رہتا ہے لیکن پھر بھی ٹریفک کا نظام خراب نہیں ہوتا اور کاروبارِ زندگی تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ غارِ حرا کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچے.....سڑک کے ساتھ ایک دیوار تھی جس کے دوسری طرف وسیع میدان اور دور وہ پہاڑ تھا جہاں غارِ حرا ہے۔ اکا دکا لوگ پہاڑ پر چڑھتے نظر آ رہے تھے.....

ان لوگوں کو دیکھ کر اکرم صاحب سے دریافت کیا کہ پہاڑ پر چڑھنے اور غار تک پہنچنے کا درست راستہ کس طرف ہے.....

وہ بتانے لگے کہ کچھ عرصہ پہلے لوگ بلا روک ٹوک اوپر غار کی طرف جایا کرتے تھے لیکن اب سعودی حکومت نے مختلف وجوہات کی بنا پر لوگوں کے پہاڑ پر چڑھ کر غار تک پہنچنے پر نیم پابندی لگا رکھی ہے.....

ہم میں پہاڑ پر چڑھنے کا پورا دم خم اور خواہش تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا.....لہٰذا سڑک کنارے کھڑے ہو کر پہاڑ کی زیارت کی.....غارِ حرا واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا.....ذہن بار بار ماضی کے اَن دیکھے مناظر کی طرف مائل ہوتا تھا کہ کس طرح چالیس سال کی عمر سے پہلے کا محمد واحمد نامی نوجوان اس راستے سے غار کی طرف جاتا ہوگا، پہاڑ پر چڑھتا ہوگا اور غار میں بیٹھ کر سوچوں میں غرق ہو جاتا ہوگا.....پھر اس نوجوان کو نبوت عطا کی گئی اور اسی پہاڑ پر خدا نے قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ شروع کیا گیا اور وہ نوجوان خدا کا محبوب ترین دوست بن گیا.....وہ نوجوان رحمت اللعالمینؐ کا درجہ حاصل کر گیا اور تمام دنیا کے لئے مقدس ہو گیا.....مغفرت کا راستہ بن گیا.....رہنمائی کا وسیلہ بن گیا.....جس نے خدا کے پیغام کو

لوگوں تک پہنچایا اور اسی پہاڑ پر جبرائیل کے ذریعے پہلا لفظ ''اقراء'' پڑھا..... ماضی کے یہ مناظر ہمیشہ اپنی طرف کھینچتے ہیں..... کچھ دیر وہیں ٹھہرنے کے بعد یہ ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا کی اور اگلی منزل کی طرف چل دیئے.....

اکرم صاحب ہر مقام کے بارے میں ہلکی پھلکی تفصیل بھی بتا رہے تھے.....موصوف سالوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں، نہ صرف خود روزگار سے وابستہ ہیں بلکہ اپنے علاقے سے دیگر کئی افراد کو بھی روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب آنے کے لئے ذاتی خدمات پیش کر چکے ہیں جس کے نتیجے میں ان کا اپنا دو یا تین منزلہ مکان ''جو شاید کرائے پر لے رکھا ہے'' میں پانچ سے زائد لوگ اکٹھے رہتے ہیں، یہی عمارت محفل سجانے کے لئے استعمال ہوتی ہے، یہی گھر مہمان خانے کا کام دیتا ہے اور یہی مکان نئے آنے والوں کے لئے سر چھپانے کا سامان کرتا ہے.....

اکرم صاحب بتانے لگے کہ ہماری اگلی منزل منیٰ، مزدلفہ، میدانِ عرفات ہے.....

شہر کے اس حصے میں ٹریفک کم نظر آ رہی تھی.....گردوپیش میں خاموشی اور سکون پھیلا ہوا تھا..... جہاں حج کے زمانے میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی.....اس وقت وہاں سکوت نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے.....اتنے دیر میں ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے.....

منیٰ میں ان ستونوں کو قریب سے ہاتھ لگا کر دیکھا جنہیں شیطان کا درجہ دے کر کنکریاں ماری جاتی ہیں.....تین ستونوں میں قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹے بڑے شیطان کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ وہاں توبہ تائب ہوئے اور شیطانوں کو بے نقط سنائیں..... ہر چند کہ شیطان ابنِ شیطان صرف جن ہے.....لیکن انسان کے اندر رہتا ہے.....اپنے اندر کی شیطانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے انسان کو شیطانی درجے پر آنا پڑتا ہے.....خود کو شیطان کا تابع دار بنانا پڑتا ہے.....اپنے ایمان اور نفس کا گلا گھوٹنا پڑتا ہے.....ضمیر کا قتل کرنا پڑتا ہے اور پھر انسان انسان کو قتل کرتا ہے.....دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے..... جب ہوش آتا ہے تو اپنا سب کیا دھرا شیطان کے سر تھوپ دیتا ہے.....یہی شیطان کی کارکردگی ہے.....اور اسی وجہ سے وہ لعنت و ملامت کا حق دار ٹھہرا.....شیطانوں سے ملاقات کے بعد آگے چلے.....

یہاں مسجدِ خیف ہے جس کے دروازے پر تالا پڑا تھا.....ٹھہر کے دعا مانگی..... یہ مسجد حج کے موقع پر کھولی جاتی ہے.....آگے مسجد مشعر الحرام تک پہنچے اور بند دروازے کے باہر کھڑے ہو کر دعا مانگی..... یہ مسجد بھی حج کے موقع پر حاجی حضرات کے لئے کھولی جاتی ہے..... یہاں سے آگے میدانِ عرفات میں پہنچے..... یہاں مسجد نمرہ ہے جو اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ یہیں سے حضورِ اکرم نے خطبہ حجتہ الوداع پیش کیا.....مسجد کی زیارت کرنے اور یہاں دعا مانگنے کے بعد جبل الرّحمت کی طرف چلے ..... یہاں کافی گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی۔ مشروبات اور کھانے پینے کا سامان فروخت کرنے والوں اور زیارت کے لئے آنے والے لوگوں کے ہاتھوں دیگر چیزیں ہاتھوں میں اٹھا کر بیچنے والوں کی کثرت نظر آتی تھی..... بچے مزے سے کھیل کود رہے تھے اور مشینی گاڑیوں کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے تھے.....جبل الرحمت کی چوٹی پر ایک سفید ستون بنا ہوا ہے جہاں

تک زینوں کی مدد سے پہنچا جا سکتا ہے.....اس سفید ستون پر مسلمان بھائیوں نے اپنی اپنی زبان میں مختلف پیغامات اور تاریخیں رقم کی ہوئی تھیں.....عشقیہ اشعار اور دیرینہ دعائیں لکھ رکھی ہیں.....اردو میں بھی لوگوں کے حسب ونسب لکھے ہوئے صاف دکھائی دیتے تھے.....فلاں ابنِ فلاں فرام چک نمبر فلاں.....سفید ستون پر کالے نیلے پیغامات اور ناموں کی اس قدر بھرمار ہے کہ اس کا سفید رنگ چھپ کر رہ گیا ہے..... یہاں کھڑے ہوئے سیکورٹی کے اہلکاروں کو دیکھ کر یہ بھی پتہ چلا کہ سعودی عرب میں حکومت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے.....اور کئی زیارات پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے والوں کو سختی سے منع کیا جاتا ہے حتیٰ کہ جھڑک بھی دیا جاتا ہے.....جبل الرحمت پر پہنچنے کے بعد ستون دیکھا اور یہاں بھی خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے رب سے دعائے خیر کی.....روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس پہاڑی پر کھڑے ہو کر نبی پاک ﷺ نے بارش کی دعا مانگی تھی اور نیچے اترنے سے پہلے ہی آسمان پر کالے بادل دکھائی دینے لگے تھے.....اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی جس نے بعد میں موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی تھی اور بنجر مینوں میں جان پیدا ہوگئی تھی.....ایک اور روایت بھی اس پہاڑی سے منسوب ہے کہ اسی جگہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ (معافی) قبول فرمائی تھی جس کی مناسبت سے اس پہاڑی کا نام جبل الرحمت پڑ گیا.....

آدھا گھنٹہ گزار کر اگلی زیارتوں کی طرف چلے گئے .....غارِ ثور کے پہاڑ بھی دیکھے اور دعا مانگی .....پھر واپسی کا سفر شروع ہوا.....راستے میں جن زیاتوں اور مقامات پر نفل ادا کرنے کا وقت ملا دو رکعت نفل ادا کئے اور جہاں وقت کی کمی آڑے آئی وہاں دعا مانگی.....واپسی پر سورج ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے پڑ چکے تھے.....ہم مسجد الحرام پہنچے اور مسجد کے باہر بنی ہوئی وضو کی جگہوں سے وضو کیا.....قیاس ہے کہ یہ وضو خانے اور باتھ روم اس جگہ پر بنائے گئے ہیں جہاں کبھی ابولہب (یا ابوجہل) کا گھر ہوا کرتا تھا.....مغرب کی نماز باجماعت ادا کی.....اور پھر جی بھر کر زم زم پیا اور دیر تک خانہ کعبہ کا طواف کرتے رہے.....آنکھیں بند کئے اپنے اندر کی نظر کو روشن کرنے کی کوشش کرتے رہے.....مقامِ ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر دعائیں مانگیں.....خانہ کعبہ کے سنہری دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر جو ہماری پہنچ سے بہت دور تھا، بہت سی دعائیں مانگی..... یہاں سیکورٹی والے کھڑے رہتے ہیں جو لوگوں کو اس سنہری دروازے کو ہاتھ لگانے سے روکتے ہیں.....احساس ہوا کہ وہ کونسا امتیاز ہے جو امتِ محمدی میں ختم کر دیا گیا ہے.....کوئی حکمران جب ہم جیسے عام مسلمانوں کی طرح ہی خدا کے حضور پہنچتا ہے.....ہماری طرح سربسجود ہوتا ہے اور ہماری طرح روتا ہے، معافیاں مانگتا ہے.....اس کے لئے سنہری دروازہ کھول دیا جاتا ہے جبکہ عام بندے کو دروازے کو ہاتھ لگانے پر بھی جھڑک دیا جاتا ہے.....کبھی کبھی اس تفریق پر جی کڑھنے لگتا ہے جب بڑے بڑے حکمران فخر سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں تو خدا نے یہ سعادت بخشی کہ ہمارے لئے سنہری دروازہ کھولا گیا اور ہم نے خانہ کعبہ کے اندر کی زیارت کی.....بھلا یہ سعادت کونسا مسلمان حاصل نہ کرنا چاہے گا..... بلاشبہ یہ سعادت حاصل کرنے والوں پر رشک آتا ہے لیکن معاملہ جب حکمرانوں کا ہوتا ہے تو حقیقتاً جی کڑھتا ہے.....شاید یہ سعادت بھی صرف نصیب والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے.....ایک

دوست بتاتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی چھت پر جو پرنالہ ہے.....اگر بارش ہو جائے تو لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں لیکن اس پرنالے کے ذریعے گرنے والے پانی کے نیچے کھڑے ہو کر بھیگنے کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتے اور یہ دوست بھی ایک مرتبہ بارش کے دوران کسی بھی طرح پرنالے کے نیچے جا پہنچے اور جی بھر کر دھکم پیل میں خود کو پانی سے بھگونے کا شوق پورا فرمایا.....اسے اگر سعادت ہی سمجھا جائے تو ہم اس سعادت سے بھی محروم رہے..... مستقبل خدا جانے.....

طواف کے دوران شعور تو غیر حاضر رہا لیکن لاشعور پورے دھیان کے ساتھ حاضر رہا.....دعائیں پڑھیں.....خدائے وحدہ لا شریک کی وحدانیت کا اقرار کیا.....پھر گھوم پھر کر مسجد کے اوپر نیچے ہر طرف کے حصوں کو دیکھا.....صف پہ بیٹھ کر تسبیح پڑھی.....نوافل ادا کئے.....عشاء کی نماز بھی باجماعت ادا کی.....کچھ ہی دیر بعد اس سرزمین سے کوچ کرنا تھا لہٰذا لمحہ لمحہ زندگی سے بھی زیادہ قیمتی تھا اور ہر لمحے کو ہم سعادت اور نعمت سمجھ کر محفوظ کر لینا چاہتے تھے.....کافی دیر بعد آخری دفعہ طوافِ کعبہ کیا.....زمزم کا کنواں دیکھا اور پانی پیا.....پھر اوپر آ کر غلافِ کعبہ سے چمٹ گئے.....جیسے کسی انسان کو اپنے پیاروں سے جدا کر دیا جائے.....کسی بچے کو زبردستی والدین کے ہاتھوں کھینچ لیا جائے اور وہ شفقت سے محروم رہ جائے.....جیسے کسی عاشق کو جبراً محبوب کے سامنے سے ہٹا دیا جائے اور وہ وقت کے مضبوط شکنجے میں پھنسا بمشکل مڑ مڑ کر اپنے محبوب کو دیکھتا ہو.....بس ایسی ہی کیفیت طاری تھی.....جو شفقت اور کرم اس گھر کی بدولت حاصل ہوا تھا اسے چھوڑنے کو دل کسی طور آمادہ نہ ہوتا تھا.....لیکن وقت ہمیں اپنے آہنی شکنجے میں لئے اس پاکیزہ گھر سے دور لے جانا چاہتا تھا.....آہ! اپنے بس میں نہ تھا کہ وقت تھم جاتا.....گھڑی رک جاتی اور لمحے اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو جاتے.....خدا کی رضا کے سامنے سرخم کیا اور دل گرفتہ، پریشاں پریشاں، جیسے کچھ کھونے کو ہو، جیسے دیوانگی طاری ہو، جیسے غیر مرئی طاقتوں کے بل پر قدم خود بخود اٹھ رہے ہوں، ہم نے مسجد سے باہر قدم رکھ دیا.....یہ ایسی گھڑی تھی جس کا خیال آتا ہے تو رقت طاری ہو جاتی ہے.....بلاشبہ اس گھڑی کے لئے کوئی مسلمان کبھی خواہش نہیں کرتا.....وہ تو پوری عمر اس احاطے کے اندر گزار دینے کی تمنا کرتا ہے.....اس سے جدا ہونے کا خیال بھی دل کو دکھانے لگتا ہے لیکن وقت، نصیب اور قدرت، یہی وہ عوامل ہیں جو انسان کے مستقبل کا تعین کرتے ہیں سو ہم سر جھکاتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ اسی کی رضا میں راضی ہوئے اور من کی مراد پائی.....

رات کے نو بج رہے تھے.....مسجد سے باہر نکلے اور پیدل اکرم صاحب کی رہنمائی میں بازار کی طرف چلے.....ایک طرف تین چار بسیں کھڑی تھیں جن کے اردگرد مسافر اور خوانچہ فروش جمع تھے.....کنڈیکٹر مدینہ مدینہ کی آوازیں لگا رہے تھے.....یہ مدینہ کی طرف جانے والی بسیں تھیں اور انہی میں سے ایک بس کے ذریعے ہم نے مدینہ روانہ ہونا تھا.....سامان گھر سے اٹھا چکے تھے.....بازار سے چند ضروری اشیاء خریدیں.....اکرم صاحب سے صلاح مشورہ کیا.....بتانے لگے کہ رات بارے یا ایک بجے کی بس کی ٹکٹ خرید لی جائے تاکہ ایک تو سفر نیند میں گزر جائے اور فاصلے کا احساس نہ ہو دوسرا صبح صبح فجر کے وقت مدینہ پہنچ کر

سب سے پہلے بارگاہِ رسالت میں حاضری دی جا سکتی ہے.....اس کے علاوہ کھانے پینے کا جھنجھٹ بھی نہیں رہے گا اور رات کا سفر پرسکون رہے گا.....مشورہ خوب تھا لہٰذا اسی لحاظ سے تیاری کی.....مدینہ میں ہمیں صرف ایک ہی دن گزارنا تھا اور دن گزار کو رات دو یا تین بجے جدہ کی طرف روانہ ہونا تھا.....لہٰذا مدینہ میں کسی رات کا قیام نہ تھا اس لئے رہنے کی جگہ ڈھونڈنے کی کوئی پریشانی نہ تھی.....ایک بس کی ٹکٹ خرید لی.....ابھی بارہ بج رہے تھے اور روانگی میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا لہٰذا بازار میں گھوم پھر کر وقت گزارا.....جگہ جگہ انگور بیچنے والے پیٹیاں لے کر بیٹھے تھے جن کی قیمت شاید دس سے پندرہ ریال ہوتی ہے.....پوری پیٹی خریدنے کے علاوہ یہ تول کر بھی انگور دے دیتے ہیں.....انگوروں کا رسیلا ذائقہ بھی پسند آیا.....کھجوریں اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء خریدیں.....اکرم صاحب بتا چکے تھے کہ راستے میں بس دو ایک جگہ پر رکے گی جہاں طعام کا کافی خرچہ ہوگا.....مہنگے کھانے اور نجانے پسند کے بھی نہ ہوں لہٰذا کھانے پینے کا بندوبست ذاتی طور پر ہی کر لیا جائے تو بہتر ہے.....یہ مشورہ دینے کے بعد اوہ بار بار روکنے کے باوجود کھانے پینے کی دیگر اشیاء خرید لائے.....اکرم صاحب سے یہ آخری ملاقات تھی کیونکہ یورپ واپسی پر جدہ ائرپورٹ پر چند گھنٹوں کے قیام کے بعد ہی پاکستان روانہ ہونا تھا اور دوبارہ مکہ آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا.....لہٰذا ان کے ساتھ خوب باتیں ہوئیں.....انہوں نے بھی پاکستان کے لئے کئی پیغامات اور چیزیں امانت رکھوائیں.....مقررہ وقت پر ہم بس کی طرف چل پڑے.....جی تو نہیں چاہتا تھا کہ یوں اس قدر جلدی اس پاک جگہ کو چھوڑ کر چلے جائیں لیکن وقت کی مجبوری تھی لہٰذا یہ سعادت آئندہ پھر حاصل کرنے کی صدقِ دل سے دعا کی.....مسجدِ حرام ابھی بھی سامنے تھی.....آخر مسلمانوں نے بھی نبی کریمؐ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تھی اور اپنے مقدس مقام سے دور چلے گئے تھے.....وہ تو پھر ہم سے زیادہ باعقیدہ اور اچھے مسلمان تھے.....لہٰذا کسی صورت تو دل کو قابو کرنا تھا.....اکرم صاحب کی میزبانی بھی اپنی طرف کھینچتی تھی.....وہ نہ صرف یہاں ملے تھے بلکہ پاکستان اپنے گاؤں میں بھی ان سے خوب جان پہچان تھی اور وہ ایک عزیز اور مہربان کی حیثیت رکھتے تھے .....بلاشبہ ایک دو دن کا ساتھ اور پھر جدائی بھی انسان کو غمگین کر کے رکھ دیتی ہے.....آخر ہر ایک کو کسی نہ کسی دن بچھڑ جانا ہے.....اور سوچنے کی بات یہ تھی کہ چلئے خدا کے گھر سے جا رہے ہیں لیکن اگلی منزل بھی تو ویسی ہی مقدس یعنی حبیبِ خدا کی سرزمین تھی.....یہ خیال دل کو سکون دینے اور ڈھارس بندھانے کے لئے کافی تھا۔

.....

رسولِ کریمؐ کا عظیم تحفہ

ہم جس زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں، یہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ یہ خدا کی بہترین نعمت ہے جس کے جواب میں ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس کی کاریگری کا اقرار کرتے ہوئے اس کا ہر حکم بجالائیں اور اس کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی وحدانیت کا اقرار کریں۔ اس کی صناعی کی تعریف کریں اور اس کی عطا کردہ بیش بہا نعمتوں کا شکر ادا کریں۔ جیسے خدا نے کائنات ترتیب دی ہے، اسی طرح زندگی دینے کے بعد زندگی گزارنے کا لائحہ عمل بھی مرتب کیا ہے، اور کچھ اصول وقوانین وضع کئے ہیں۔ جن پر عمل کر کے ہی ہم اس کی نظر میں اور میدانِ آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ خدا کی سب سے بڑی نعمت جو کسی بھی مسلمان کو ملتی ہے وہ اس کی مسلمان گھرانے میں پیدائش ہے۔ پھر مسلمان بچے کے کان میں اذان دی جاتی ہے۔ اس کی ان چھوئی سماعتوں کو اللہ کے نام سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ پھر وہ اسلامی معاشرے میں پلتا بڑھتا ہے۔ جوان ہوتا ہے۔ خدا کا عطا کردہ رزق کھاتا ہے اور ہر مصیبت میں اس کی پناہ طلب کرتا ہے۔ پھر یہی مسلمان اپنی جمع پونجی خرچ کر کے سرزمینِ حجاز کی طرف نکلتا ہے، حرم پاک اور روضۂ نبیؐ کا دیدار کر کے اپنی من کی مراد پاتا ہے۔ مسلمان گھرانے میں پیدائش کے بعد ''زیارتِ حرم اور دیدارِ روضۂ اقدس'' خدا کی سب سے بڑی نعمتیں ہیں جنہیں اللہ نے نہ صرف تسکینِ روح کا ذریعہ بنا دیا بلکہ اس کی صورت میں مسلمانوں کے ایمان و عقیدے کی پختگی کا ایک اور راستہ متعین کر دیا۔ آج اگر ہم سینہ تانے ایک پاسپورٹ دکھا کر مدینہ و مکہ کی سرزمین میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں، بلکہ یہ ہمارے بزرگانِ اسلام کی قربانیوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ اسلام کے ابتدائی سپاہیوں کی فتح کا ثمر ہے۔ یہ ہمارے پیارے نبی کریمؐ کا ہر مسلمان کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔ ان کی قربانیوں کی بدولت آج ہم بے حد آسانی سے ان مقدس شہروں میں خوشی خوشی داخل ہو سکتے ہیں۔ کل تک جن شہروں کی حدود میں اہلِ قریش اور کفار و یہود کے قبائل چھپ کر بیٹھتے تھے کہ ان کو کوئی تنہا مسلمان یا کمزور اسلامی قافلہ نظر آ جائے تو اسے ایذا پہنچا کر اپنے شیطانی دل کی تسکین کر سکیں۔ آج اسی حدود پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ آج کسی مسلمان یا کسی قافلے کو مکہ مکرمہ کی حدود میں داخل ہونے پر کوئی خدشہ درپیش نہیں، کسی مسلمان کو مکہ و مدینہ کا سفر اختیار کرنے پر کوئی خطرہ لاحق نہیں کہ کہیں وہ تہہ و تیغ نہ کر دیئے جائیں، یا کسی غیر مسلم کے ہتھے چڑھ کر ان کے ظالم دلوں کے لئے تسکین کا سامان نہ بن جائیں، یا ان کی عورتوں کی عزت و ناموس خطرے میں نہ پڑ جائے یا ان کے اونٹوں اور قافلوں کو لوٹ نہ لیا جائے، یا انہیں غلام بنا کر تپتی ریت میں لٹا نہ دیا جائے، انہیں گھوڑوں کی دم کے ساتھ باندھ کر پتھروں پر نہ گھسیٹا جائے، انہیں انگاروں پر ننگی کمر نہ لٹایا جائے یا ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی سخت سلوک کیا جائے..... آج کا مسلمان جو سر اٹھائے مکہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ جو محض ایک کاغذی دستاویز دکھا کر، جو اس کے

مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کرے، ان مقدس فضاؤں میں آزادانہ داخل ہوسکتا ہے۔ اسے کسی قسم کے جانی و مالی نقصان یا جنگ وجدل کا اندیشہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے نبی کریمؐ کا وہ خوبصورت تحفہ ہے جس کا اجر ہم تا قیامت کبھی پورا نہیں کر سکتے۔

یہ مکہّ مکرمہ ہے۔ یہاں نبی کریمؐ کی ولادت ہوئی۔ یہاں آمنہ کے لال نے آنکھ کھولی۔ یہاں محمدؐ نے اپنی جوانی اور لڑکپن کے دن دیکھے اور یہیں محمدؐ بن عبداللہ کو سعادت نبوت عطا کی گئی۔ پھر اسی شہر کی زمین، یہاں کے بیٹے کے لئے تنگ کر دی گئی۔ اسے اپنی ماں، اپنی دھرتی کو چھوڑنا پڑا۔ اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ یہ ہجرت، تاریخ کا ایک عظیم الشان سبق ہے۔ نبی کریمؐ مدینہ تشریف لے جاتے ہیں۔ تو مدینہ کی آبادی مہاجروں کے لئے اپنے گھروں کے دروازے اور باغیچوں کی باڑیں کھول دیتے ہیں۔ اہلِ مدینہ کی طرف سے مکی بھائیوں کے لئے بھائی چارے، سخاوت اور ایثار کے مقدس ترین باب مرتب کئے جاتے ہیں۔ مدینہ کی سرزمین اس شخص کو خوش آمدید کہتے ہوئے پھولے نہیں سماتی، جس کے لئے یہ ساری کائنات پیدا کی گئی۔ جس کے لئے یہ دنیا اور یہ زندگی بنائی گئی۔ اور پھر یہی سرزمین حبیبِ خدا کی دائمی آرام گاہ بن جاتی ہے۔ یہ سعادت پوری کائنات میں سے زمین کے صرف اسی خطے کو عطا ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک دور ایسا بھی آتا ہے جب اِس کے فراق میں اداس، مکہ کی دھرتی اپنے سپوت کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ وطن کی مٹی اپنے فرزند کو یاد کرتی ہے۔ اور پھر فتح مکہ جیسا عظیم الشان واقعہ پیش آتا ہے۔ یہ فتح دنیا کی سب سے عظیم فتح تھی..... جس شخص کو اہلِ مکہ نے ساحر، کاہن، جادوگر، شاعر، اور نجانے کیا کیا کہہ کر مدینہ ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس شخص کے لئے مکہ میں سانس لینا دشوار کر دیا گیا تھا۔ جس شہر کے باسی محمدؐ کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ آج وہی محمدؐ فتح کا پرچم بلند کئے اپنی دھرتی ماں کے قدموں میں سجدہ ریز ہونے آئے تھے۔ انہوں نے اس مٹی کے سپوت ہونے کا فرض نبھا دیا۔ انہوں نے اس دھرتی کے بیٹے ہونے کا ثبوت دیا۔ جن لوگوں نے آپؐ پر سختیاں کر کے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آپؐ انہیں کے لئے رحمت بن کر آئے۔ آپ نے انہیں امان دی۔ آپؐ نے انہیں پناہ دی۔ انہیں پھر سے وحدانیت کا سبق دیا۔ لات و منات اور خدائے وحدہ لاشریک کے درمیان فرق کا احساس دلایا۔ یہ فتح آقائے نامدار کی تھی۔ یہ فتح اسلام کی تھی..... یہ فتح ہر مسلمان کی تھی۔ یہ فتح رہتی دنیا تک ان سپاہِ اسلامؐ اور ان کے امیر رسولِ اکرمؐ کا تمام مسلمانوں کے لئے حسین ترین تحفہ تھا۔ اور اس دن کے بعد سے اس مقدس شہر مکہ کی حکومت کا پروانہ ہمیشہ کے لئے اہلِ اسلام کے ہاتھ میں تھما دیا گیا تھا۔

آج اگر ہم بڑے فخر سے سینہ تان کر اس شہر میں داخل ہوتے ہیں کہ ہمیں حرم پاک کی زیارت نصیب ہو رہی ہے..... یا ہمیں سبز گنبد کے دیدار کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ تو یہ صرف اور صرف اس ذاتِ اکملؐ کی فتح کی بدولت ہے۔ لہٰذا مکہ و مدینہ میں داخل ہوتے ہوئے عقیدت مندی، شُکرِ خداوندی پر دھیان تو دینا ہی چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا چاہئے کہ آج اگر ہم ان جگہوں پر بلا روک ٹوک داخل ہو جاتے ہیں تو یہ صرف اُن اہلیانِ اسلام کی بدولت ہے جو رحمت

اللعالمینؐ کی رہنمائی میں مکہ چلے آئے تھے۔ یہ ہر مسلمان کے لئے ایک عظیم تحفہ، ایک نعمت اور مقدس فتح ہے۔ جو نبی پاکؐ اور ان کے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو نصیب ہوئی لیکن اس کا ثمر رہتی دنیا تک یہاں آنیوالا ہر مسلمان کھاتا رہے گا۔ ہمیں مدینہ و مکہ میں داخل ہوتے ہوئے اپنی ذات کے لئے پناہ اور توبہ تائب ہونے کے ساتھ ساتھ ان محسنوں کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے..... کہ شاید خدا قیامت کے دن ہم سے یہ سوال پوچھ لے..... کہ اے سرخرو مسلمان! بتا..... کیا تو نے مکہ میں داخل ہوتے یہ سوچا تھا کہ کبھی یہاں اہلِ قریش اور کافروں کے سورما گھات لگا کر بیٹھا کرتے تھے اور مسلمان خوف و خطرے میں گھرے رہتے تھے۔ اور ایک دن تم بے خوف ہو کر سر اٹھائے ہمارے گھر چلے آئے۔ تو کیا یہ بھی سوچا کہ یہ ہمت کیونکر تم میں عود آئی۔ کہ یہ فخر کس فتح کی بدولت تمہارے سینے میں داخل ہوا۔ کہ تم کیونکر اس قدر آسانی سے میرے گھر حاضری دینے پہنچ گئے جہاں کبھی وحشی کفار مسلمانوں پر گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے..... وہاں تم سر اٹھائے مزے سے اس سرزمیں میں داخل ہو گئے..... کیا کبھی یہ بھی سوچا کہ اس قدر آسانی کیسے مل گئی..... اور کیا تم نے کبھی اپنے نبیؐ کے اِس تحفۂ عظیم کا شکریہ ادا کیا؟..... پھر اس دن ہمارے پاس جواب دینے کے لئے کچھ بھی نہ ہوگا۔

سوئے مدینہ

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ

شاعر نے کس قدر خوبصورتی سے ہر اس مسافر کے دل کا حال بیان کر دیا ہے جو مدینے کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ جب کوئی مسلمان کعبہ کی حدود میں داخل ہو رہا ہوتا ہے تو وہ مارے رعب اور عقیدت کے پانی پانی اور سرور کی کیفیت میں ڈوبا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کی فلم اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگتی ہے۔ اور پھر طوافِ کعبہ کے بعد جب دل کو کچھ اطمینان حاصل ہوتا ہے تو یہ مسافر مکہ کی زیارتوں سے فیضیاب ہوتا ہے اور پھر حبیبِ خدا کی سرزمین کی طرف کوچ کرتا ہے۔ اس وقت اس مسافر کا دل خوشی سے باغ باغ ہوتا ہے۔ اس کا وجود ایک چھوٹے سے قلقاریاں مارتے بچے جیسا ہو جاتا ہے۔ وہ بچے کی سی کیفیت کا مسافر پھر مدینہ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے بے قابو دل میں جھرنوں اور آبشاروں سے گرتے ہوئے پانی کی آواز کی طرح سریلی دھڑکنیں اس کے سینے پر دھمک پیدا کرتی ہیں۔ اور وہ مسلمان مسافر بے قابو دل کو مشکل سے سنبھالے ہوئے مدینہ کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

ہم بھی ایسے ہی مسافر تھے جو اب مدینے کی طرف رواں دواں تھے۔ بس مکہ سے نکل کر موٹروے پر چڑھ گئی تھی اور اندھیری رات میں سرعت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور مسافر اونگھنے لگے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی آواز میں کسی کے درود پڑھنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ یقیناً ہر کوئی درور کا ورد جاری کئے ہوئے نیند کی وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔ ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ درور پڑھتے، پھر آنکھ لگ جاتی، آنکھ کھلتی تو تھوڑی دیر کھڑکی سے باہر اور بس کے اندر اندھیرے میں دیدے پھاڑ کر دیکھتے اور پھر درور پڑھنے لگ جاتے۔ نجانے کس پہر مستقل آنکھ لگ گئی اور اسی وقت جاگ آئی جب بس مدینے کی حدود میں داخل ہو رہی تھی اور مسافروں کے پاسپورٹ اور کاغذی دستاویزات چیک کی جا رہی تھیں۔ یعنی کہ ہماری منزل نزدیک آ گئی تھی۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ جب انسان کسی لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہے جس سے اس کو جذباتی لگاؤ بھی ہوتا ہے۔ وہ سارے راستے سفر کٹنے کی بے تابانہ دعا کرتا رہتا ہے اور جب اس کی منزل اس سے محض چند کوس، چند میل یا، چند منٹوں کے فاصلے پر رہ جاتی ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ کہیں چھپ جائے، یا پھر سے پیچھے چلا جائے اور اس کے دل میں انتظار اور منزل کو پانے کی ''جوشیلی'' کیفیت جوں کی توں جاری رہے۔ لیکن منزل سامنے آ جاتی ہے اور انتظار کا سحر ٹوٹ جاتا ہے

۔

یہ ایک دن ہماری زندگی کا بہترین اور خوبصورت ترین دن تھا۔ یہ چوبیس گھنٹے اور اس مخصوص وقت کے سب لمحے، اپنے اندر

ہزاروں سالوں کی خواہشات سموئے ہوئے تھے۔ یہ بدنصیب مسافر جو رضائے الٰہی کی بدولت خوش نصیبوں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا، ہرگز اس قابل نہ تھا کہ اپنے بل بوتے پر اس سرزمین پر آ سکتا، یہ تو دینے والے کی رضا تھی۔ جو کسی کو محبت و التفات سے، کسی کو تنبیہہ کی خاطر اور کسی کو اپنے اوصافِ رحمانی کے تحت کعبہ و گنبد کی زیارت سے نواز دیتا ہے۔

ڈیڑھ دن مکہ اور ایک دن مدینے کی زیارت عطا کر کے اِس پیاسے انسان کی پیاس بجھانے کا سامان اُس ذاتِ اکبر نے کیا تھا۔ صبح کاذب کا وقت تھا جب گاڑی بس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ مسافر پہلے ہی پولیس چوکی پر ہونے والی چیکنگ کی وجہ سے جاگ چکے تھے۔ بس رکنے کے بعد سارے مسافر آہستہ آہستہ بس سے اترے اور اپنا اپنا سامان لے کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہونے لگے۔ ان میں سے بیشتر ایسے مسافر تھے جو ہماری ہی طرح مسجدِ نبوی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ سفید روشنیوں میں نہائی ہوئی بس اسٹیشن کی عمارت سرزمینِ چاند کا کوئی خوبصورت خطہ لگ رہی تھی۔ ہم اپنا ہلکا پھلکا سامان اٹھائے بس اڈے سے باہر نکلے۔ ویران شہر، اجنبی مسافر، نہ راہوں کی خبر، نہ راستہ کا پتہ، نہ قیام و طعام کا انتظام اور نہ کوئی جان پہچان..... اگر ہم اس بات پر پریشان ہو جاتے کہ ہماری منزل کہاں ہے اور ہمارے سر چھپانے کا سامان کیا ہوگا تو شاید یہ ہماری سب سے بڑی بے وقوفی ہوتی۔ مدینہ تو وہ سرزمین تھی جس نے ماضی میں بھی مسافروں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا اور انہیں پناہ دی بلکہ آج دے رہی ہے۔ پھر بھلا ہماری پریشانی کا جواز کیا رہ جاتا تھا۔ یہاں آنے والوں کی منزل، طعام و قیام، اور راحت تو صرف اور صرف سبز گنبد کی زیارت سنہری جالی کا دیدار، اور مسجدِ نبوی کی مقدس فضا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہی ہماری منزل اور یہی ہمارا مقصد تھا۔ ہمیں کسی قیام گاہ کی تلاش کی فکر نہ تھی۔ اور نہ اور کسی ضرورت کا تقاضا..... ہر قسم کی پریشانی سے بے نیاز ہو کر آگے چلے۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ پرامن فضا اور پرسکون خاموشی میں ہر شے درود پڑھ رہی ہے۔ ہوا سرسراتی ہوئی بدن سے ٹکرا رہی تھی اور ایسے لگتا تھا کہ مقدس گیت گا رہی ہو۔ بس کے مسافروں میں چند پاکستانی افراد بھی تھے۔ ان کی منزل بھی مسجدِ نبوی ہی تھی۔ انہوں نے کسی سے مسجدِ نبوی کو جانے والا راستہ پوچھا اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مسجد کے بلند اور پرشکوہ مینار نظروں کے سامنے تھے۔ ہمارا دل دھڑک کر رہ گیا..... اپنے وجود میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ قدم اور آگے بڑھا سکتے..... مشتاق نظروں سے مسجد کے میناروں اور سبز گنبد کو دیکھنے لگے..... پھر وہی غیر مرئی طاقت جو مکہ میں ہمیں حرم کی طرف کھینچتی تھی، یہاں بھی اپنا اثر دکھانے لگی اور قدم خود بہ خود آگے اٹھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے جیسے نام نہاد مسلمان میں ان مناظر کو دیکھتے رہنے کی تاب نہیں ہے۔ لہٰذا نظریں خود بخود نیچے جھک گئیں۔ زبان درودِ پاک کا ورد کرنے لگی۔ چلتے چلتے ہم مسجدِ نبوی کے عین سامنے پہنچ گئے۔ مارے مسرت اور عقیدت کے، جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ بس یہیں کھڑے رہیں اور اشتیاق سے ان مقدس نظاروں سے دل کو لطف پہنچاتے رہیں۔ اپنی خوش نصیبی پر رونا آ رہا تھا۔ اتنے میں فجر کی اذان سنائی دی۔ مسجد کے احاطے میں داخل ہو کر ایک کونے میں اپنا سامان رکھا۔ اور وضو خانے کی طرف بڑھ

گئے۔عورتوں کے لئے اندر کی طرف علیحدہ وضو کا انتظام تھا۔وضو کے پانی کے علاوہ مکہ سے مدینہ تک آبِ زم زم بھی بذریعہ پائپ لائن یا واٹر ٹینکس کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے لہٰذا پینے کے لئے یہاں بھی آبِ زم زم وافر مقدار میں دستیاب تھا۔پوری رات سفر میں کٹ گئی تھی۔بس میں سیٹ پر الٹے سیدھے بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح سونے کی کوشش کی تھی لیکن بدن میں تھکاوٹ کا عنصر باقی تھا۔وضو کے بعد مسجد میں داخل ہوئے اور اندر سے عمارت کو نہایت مشتاق نظروں سے دیکھنے لگ گئے۔شاید یہاں بھی قدرت کو ہمیں انتظار کروانا مقصود تھا۔جیسے ہی ہم بائیں طرف روضے کی سنہری جالی کا دیدار کرنے کے لئے آگے بڑھے ،جماعت کھڑی ہوگئی اور ہمیں چار و ناچار صف بندی کرنا پڑی۔ایسا ہی ہمارے ساتھ کعبہ کی طرف بڑھتے ہوئے ہوا تھا۔کہ ہم جس قدر اشتیاق سے کعبہ کی طرف بڑھنا چاہ رہے تھے،اسی وقت جماعت کھڑی ہوگئی اور ہماری منزل ہمارے سامنے چار رکعت کے فاصلے پر رہ گئی۔اب پھر یہی معاملہ یہاں تھا۔نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد امامِ مسجد نے دعا پڑھی۔مسجدِ نبوی میں ہماری پہلی دعا تھی،سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا مانگا جائے،یہ وہ جگہ تھی جہاں اسلام کی تاریخ مرتب کی گئی،یہ اس انسان کی آرامگاہ تھی جس کے لئے کائنات اور دنیا بنائی گئی۔اِس سے بڑی سعادت اور نعمت کیا ہوتی جو ہم خدا سے اب بھی مانگتے کہ ہمیں اس نے روضہ اقدس کی زیارت نصیب کی۔اگر کسی طور کوئی اور نعمت مانگتے تو یہ ڈر تھا کہ خدا کہیں ہم سے ناراض ہی نہ ہو جائے کہ اے لاعلم انسان!سب سے بڑی نعمت جو گنبدِ خضرا کا دیدار اور روضے کی زیارت ہے،میں تجھے عطا کر چکا ہوں،اور تو ہے کہ یہاں پہنچ کر بھی مجھ سے مزید نعمتوں کی خواہش کرتا ہے۔کیا اس زیارت سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت تیرے لئے اہم اور مقدس ہے۔لہٰذا ہمیں تو صرف شکر ہی شکر کرنا تھا۔مانگنے سے ڈر لگتا تھا.....ہاں!یہ مانگ ضرور کی کہ اس در پر ہمیں دوبارہ بلا.....بار بار بلا..... ہماری ساری زندگی،سارا جیون یہیں گزر جائے.....ہمارا سانس اسی در پر نکلے.....ہماری خاک اسی مٹی میں مل جائے.....ہمیں روزِ آخرت میں اسی سرزمین سے اٹھایا جائے۔بس اس کے علاوہ تو شکر ہی شکر کرنا تھا۔دعا کے بعد لوگ ہجوم کی صورت میں روضے کا دیدار کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔ہم بھی اٹھ کر اس ہجوم میں داخل ہو گئے۔عورتوں کے لئے نماز پڑھنے کا الگ حصہ تھا۔اور روضے کی جالیوں کا دیدار کرنے کے لئے بھی ان کے لئے مخصوص گوشہ تھا۔سنہری جالیوں کے سامنے سیکورٹی پر مامور اہلکار نہایت چوکس کھڑے تھے۔وہ نہ تو کسی کو جالیوں کو چھونے کی اجازت دیتے تھے اور نہ ہی کسی شخص کو ایک لمحہ ٹھہر کر جی بھر کے جالیوں کا دیدار کرنے یا ان جالیوں میں سے اندر جھانکنے کی مہلت دیتے تھے۔ہاتھ اٹھا کر درود پڑھنے اور دعا مانگنے کی بھی ممانعت تھی۔اگر کوئی شخص ان میں سے کسی بھی غلطی کا مرتکب ہو جاتا تو سیکورٹی والے نہ صرف خفگی کا اظہار کرتے بلکہ اس شخص کو جھڑک دینے کے علاوہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کا ستعمال کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ان کا یہ رویہ ایک مسلمان کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوسکتا تھا۔شاید یہ عقیدت مندوں کا قصور ہو کہ وہ ہی عقیدت مندی کے لئے بھانت بھانت کے طریقے اختیار کرتے ہوں جو ان عربوں کے لئے ناپسندیدہ ہو۔لیکن وجہ جو بھی رہی ہو،جالیوں کو چھونے اور چومنے کی کسک دل نادان

میں باقی رہ گئی.....

ایک دفعہ گزر جانے کے بعد پھر دو مرتبہ اس ہجوم میں داخل ہو کر ہم نے سنہری جالیوں کا دیدار کیا اور اپنے دل کو تسکین پہنچائی۔ زبان پر مستقل درود شریف جاری تھا۔ پو پھٹنے لگی تو ہم روضے کے بالکل ساتھ والے دروازے سے باہر نکل کر شمالی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ شاید مشرق میں جنت البقیع نامی قبرستان تھا۔ مسجد میں سینکڑوں افراد نظر آ رہے تھے۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ ہم نے جی بھر کر مسجد کے تمام احاطے دیکھے اور پھر وہیں اپنی جگہ پر آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ لوگ سنہری جالیوں کا دیدار کر کے باہر نکل رہے تھے۔ مسجد کی چھت پر سبز گنبد اپنی آب و تاب کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ نجانے کب درود پڑھتے اور پرسکون مقدس فضا کی وجہ سے آنکھ لگ گئی اور ہم ٹیک لگائے سو گئے۔

بعداز دیدار، طعام وقیام

دن نکلتے ہی جب کاروبارِ زندگی رواں دواں ہوا۔تو شہر دیکھنے کی تمنا دل میں جاگ اٹھی۔اس کے علاوہ طعام وقیام کا بھی مناسب بندوبست کرنا تھا۔ہمیں مدینہ میں صرف آج کا ایک دن گزارنا تھا۔رات کے پہلے پہر جدہ کی طرف روانہ ہونا تھا۔پچھلے چوبیس سے زیادہ گھنٹوں میں تسلسل کے ساتھ سو نہ سکے تھے۔اوراب بے ڈھنگے جانور کی طرح مسجد کے صحن میں ٹانگیں پسار کر سونے کی بے ادبی کرنے پر دل آمادہ نہ تھا۔لہٰذا جیسے ہی سورج نے شہرِ مدینہ پر اپنی کرنیں بکھیر دیں..... جب لوگ گھروں سے نکل کر اپنے اپنے کام پر جانے لگے..... جب کھجوریں، تسبیحوں اور چیزیں بیچنے والوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں..... جب رات کے سوئے ہوئے کبوتر سبز گنبد اور مسجد کی دیواروں میں بنائے گئے اپنے آشیانوں سے نکل نکل کر رزق کی تلاش میں مسجد کے صحن میں اترنے لگے اور پرندوں کے غول مدینہ کی فضا میں پرواز کرنے لگے.....تو ہم اپنی جگہ سے اٹھے اور کسی مناسب ہوٹل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔شمال میں دو سڑکیں کراس کرنے کے بعد ہی ہمیں ایک مناسب ہوٹل مل گیا۔یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔پچاس ریال میں ایک آرام دہ کمرہ..... یہ ایک پاکستانی شخص کا ہوٹل تھا جس کا نام ہم یاد نہ رکھ سکے۔ پکی عمر کا یہ شخص عربوں جیسا لباس پہنے اپنے ہوٹل کے باہر کرسی بچھائے اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔پہلی نظر میں ہمیں کوئی عربی لگا.....لیکن جیسے ہی گفتگو شروع ہوئی تو اس نے پاکستانی کے طور پر اپنا تعارف کروایا کہ وہ رحیم یار خان کا رہنے والا ہے اور سعودی عرب میں اسے بیس سال سے زائد ہو گئے ہیں۔اور کرائے کی عمارت میں آج کل یہ ہوٹل کامیابی سے چلا رہا ہے.....انہوں نے کمالِ مہربانی سے ایک عمدہ کمرہ مہیا کر دیا.....

صاف ستھرے سفید بستر،خوبصورت پردوں سے آراستہ،ائر کنڈیشنڈ اور آرام دہ کمرہ تھا۔نہا دھو کر پانچ گھنٹے کی بھرپور نیند لی ۔ظہر کی نماز کے وقت آنکھ کھلی۔نماز مسجدِ نبوی میں ہی ادا کی۔اب دوپہر کے کھانے کا مسئلہ تھا۔یہ مسئلہ بھی اسی مہربان پاکستانی نے بآسانی حل کر دیا۔شاید اسی ہوٹل میں پاکستانی کھانا بھی پکایا جاتا تھا۔دال کے ساتھ تندوری نان.....اس سے بڑھ کر پیٹ پوجا کا سامان اور کیا ہوتا.....لہٰذا جی بھر کر کھایا.....

ابھی مدینہ کی زیارتیں کرنا باقی تھیں..... ہمارے پاس عصر سے مغرب تک کا وقت تھا.....ان دو تین گھنٹوں میں زیارات دکھانے کا فریضہ ایک ہم وطن دوست، جو اپنے ہی شہر ''خانیوال'' سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے ادا کیا.....ان سے ہماری ملاقات مکہ کے میاں اکرم صاحب کے توسط سے ہوئی۔اکرم بھائی نے ہماری مدینہ روانگی کے وقت انہیں فون کر کے ہماری آمد کے متعلق بتا دیا تھا اور انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے مہمان نوازی کا فریضہ سرانجام دیا۔اتنی تھوڑی دیر میں وہ ہمیں مسجدِ قبا، مسجدِ

قبلتین ،جبلِ احد،میدانِ احد،اور مسجدِ عمرِ فاروق،مسجدِ ابوبکر،مسجدِ علی کے علاوہ دیگر مقدس مقامات پر لے گئے۔ان تمام مقامات کی تاریخ سے ہر مسلمان کسی نہ کسی حد تک واقف ہے۔مسجدِ قبلتین وہ مسجد ہے جہاں قبلہ کی تبدیلی کے وقت نماز کے دوران ہی جماعت کا رخ تبدیل کرلیا گیا۔نمازی جو پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کر رہے تھے،تبدیلی قبلہ کے حکم کے وقت فوراً حضورِ اکرمؐ کی امامت میں قبلہ رو(بیت اللہ) ہو گئے۔مسجدِ قبا تاریخ اسلام کی سب سے پہلی مسجد تھی جس کی تعمیر کا پہلا پتھر آنحضرتؐ نے خود رکھا تھا۔مسجدِ قبلتین میں ہم نے نمازِ مغرب بھی ادا کی۔مسجد کے باہر چند لوگ چھوٹے چھوٹے کپڑے بچھا کر تسبیحیں،مسواک،دعائیں،اور عطر بیچ رہے تھے۔مسجدِ قبا،اور دیگر مساجد میں ہم نے نوافل ادا کئے۔احد کے وسیع میدان میں آدھا گھنٹا گزارا۔جبلِ احد تک جانے کا وقت نہ تھا کہ یہ خواہش بھی کسک بن کر دل میں ہی رہ گئی.....میدانِ اُحد کے درمیان بنے اس احاطے کی جالیوں کے پاس بھی ان صحابہ کرام کے لئے دعا پڑھی جو احد کی جنگ میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے تھے۔اور اس احاطے کی چار دیواری ان کی آخری آرام گاہ تھی۔صدیوں پرانی تاریخ،میدان کی فضا اور احد کی پہاڑی پر سانس لیتی محسوس ہوتی تھی۔یہ چوٹیاں اور یہ میدان،ہم مسلمانوں سے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم ان کی عزت و ناموس جو کہ دراصل اسلام کی عزت ہے، کی خاطر اپنا تن من دھن وار دیں۔لیکن آج کا مسلمان کمرشلائزڈ ہو گیا ہے۔کبھی وہ مسلمان بھی تھے جو گنتی بھر تعداد میں پوری پوری ریاستوں سے جا ٹکراتے تھے اور آج یہ مسلمان بھی ہیں جو دنیا کے ہر گوشے میں آباد ہیں۔وسائل،فہم و فراست،علم سب کچھ رکھتے ہیں لیکن ایمان کی وہ حرارت اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی غیرت اور جذبہ جو اُن پارہ صفت سپاہیوں کے بدن میں مچلتا تھا،اب اِن مسلمانوں کے دل میں اپنی موت آپ مر گیا ہے۔جوش و جذبہ اور محنت،علم کی طلب،آگے بڑھنے اور دنیا پر اسلام کی حکمرانی قائم کرنے کی خواہش اب جھاگ بن کر بہہ چکی ہے۔اب مسلمان ہر طرف بمشکل اپنا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔اب پھر سے کسی ایوبی،کسی سیف اللہ،کسی بن قاسم،اور کسی زنگی کا انتظار ہے۔

.....

وہ جگہ ہمارے کس کام کی

زیارات سے واپسی پر ہم مدینہ کے بازاروں میں گھومتے رہے۔ ہر طرف مختلف انواع واقسام کی کھجوروں کے سٹال نظر آتے تھے۔ تسبیحوں، ٹوپیوں، عطر، اور پھلوں کی بہتات تھی۔ صرافہ بازاروں میں چمکتی دمکتی دکانیں اور جواہرات سے لدی پھندی دکانیں تھیں۔ کھلونوں، گھریلو روزمرہ کی اشیاء اور الیکٹرونکس کے سامان کی جا بجا دکانیں تھیں۔ یہاں سے ہم نے پاکستان واپسی پر عزیز واقارب کے لئے ٹوپیاں، خوشبوئیں اور تسبیحیں خریدیں۔ ہوٹل واپس جا کر اپنا ہلکا پھلکا سامان اٹھایا اور مسجدِ نبوی میں آن پہنچے۔ چند گھنٹوں بعد ہمیں اس مقدس شہر سے چلے جانا تھا لہٰذا یہ گوارا نہ تھا کہ یہ چند لمحے شہر کی روشنیوں میں گھوم پھر کر گزارے جائیں۔ ایک طلب جنت البقیع میں داخل ہونے کی بھی تھی۔ کہ یہ قبرستان دن کے کسی مخصوص وقت میں زائرین کے لئے کھلتا ہے اور اب عشاء کا وقت ہوا چاہتا تھا اور یہ مخصوص وقت دن کے کسی پہر گزر چکا تھا۔ مدینہ کی فضا نے خاموشی، رات اور ٹھنڈی ہوا کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مسجد کے ٹھنڈے فرش اور دیواروں سے زیادہ شاید کوئی اور نرم و گداز بستر ہمیں زندگی بھر کہیں نہ مل سکتا تھا۔ ہم بار بار روضے کی سنہری جالیوں کا دیدار کرتے تھے اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے تھے۔ جنت البقیع سامنے تھا جہاں اعلیٰ اوصاف کے حامل صحابہ کرام اور مسلمان ابدی نیند سو رہے تھے۔ قبرستان میں داخلے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو دعا کے بعد کسی کی نماز جنازہ کا اعلان کیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ جنت البقیع میں داخل ہو کر صحابہ کرام کی قبروں کی زیارت کرنا چاہتے ہیں وہ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کسی کی نمازِ جنازہ کا اعلان کیا جائے اور میت کو تدفین کے لئے جنت البقیع لایا جائے۔ اس موقع پر زائرین جنازے کے ساتھ قبرستان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم بھی جنازے کے ساتھ قبرستان میں داخل ہو گئے۔ کافی تعداد میں سیکورٹی اہلکار زائرین اور جنازہ کیساتھ چلتے ہوئے افراد پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ زائرین کو زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ کے بعد قبرستان سے باہر نکال دیا جاتا ہے جبکہ تدفین کے لئے صرف میت کے عزیز واقارب اندر رہ جاتے ہیں۔ باقاعدہ طور پر قبرستان کا ایک نقشہ بھی ملتا ہے جس پر نشاندہی کی گئی ہوتی ہے کہ قبرستان کے کس احاطے میں کس شخصیت کی آرام گاہ ہے۔ ہمارے پاس یہ نقشہ بھی موجود نہ تھا۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ سیکورٹی اہلکار ہمیں چھڑی دکھا کر قبرستان سے باہر کرتے، ہم نے گھوم پھر کر جتنی قبروں کا ہو سکا، دیدار کر لیا..... قسمت میں یہی لکھا تھا..... ہم خدا کی ہر رضا پر راضی تھے..... ہم نے ہر قبر کو یکساں محبت اور عقیدت سے دیکھا..... کوئی قبر چھوٹی ڈھیریوں کی صورت میں تھی، کہیں پتھروں سے صرف دائرہ بندی کی گئی تھی۔ کہیں کسی مٹی کے احاطے کے سر پر پتھر نما سل رکھی گئی تھی۔ بہر حال کچھ دیر بعد ہمیں قبرستان سے باہر نکال دیا گیا۔ اب ہماری منزل آخری دفعہ روضہ اقدس کا دیدار تھا اور مسجد میں نوافل ادا

کرنے تھے.....لہٰذا ہم اسی لطف میں مشغول ہو گئے.....

ہمیں اگلے دن علی الصبح جدہ پہنچنا تھا۔ جدہ سے دن دس بجے کی لندن کے لئے فلائٹ تھی۔ لہٰذا ہر قیمت پر ہمیں مدینے سے رات بارہ بجے نکلنا تھا۔ مدینہ کی معطر فضائیں اور مسجد میں چلنے والی دھیمی دھیمی ہوا کا سرور ہمیں کسی صورت یہ جگہ چھوڑنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ بھلا ایسا کونسا مسلمان ہو گا جو اپنی مرضی سے ان لطیف فضاؤں اور سنہری جالیوں کو چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہو گا..... یہاں ایک خوبصورت اور سبق آموز واقعہ یاد آتا ہے جو ہمارے اپنے الفاظ میں پیشِ خدمت ہے.....

''مدینہ میں ایک مرتبہ کسی مسلم ملک کے کوئی بزرگ روضے کی محبت میں قیام پذیر تھے۔ اللہ کی مہربانی سے ان کے یہاں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ کافی عرصے بعد جب وہ واپس اپنے وطن کو لوٹنے لگے تو ایک عورت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی جس کے ساتھ اس کا سات آٹھ سالہ بچہ بھی تھا۔ وہ دونوں کافی خستہ حال لگ رہے تھے۔

عورت نے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا.....

اے بزرگ! میں بیوہ عورت اس بچے کی پرورش کا بیڑا اٹھانے سے قاصر ہوں۔ آپ خدا ترس انسان ہیں۔ اگر جوانی کی عمر تک میرے اس بچے کو اپنے پاس رکھ لیں تو نہایت مہربانی ہو گی.....چاہیں تو جوانی میں ہی آپ یہ بچہ مجھے واپس لوٹا دیں.....

وہ بزرگ بخوشی اس بیوہ عورت کی بات مان گئے اور اپنے وقتِ مقررہ پر اس بچے کو ساتھ لے کر اپنے وطن کے سفر کو نکل پڑے.....

ابھی یہ قافلہ مدینہ کی حدود میں ہی تھا کہ بچے نے معصومیت سے سوال کیا.....

یا شیخ! جہاں آپ مجھے لے جا رہے ہیں.....کیا وہاں کھیلنے کے لئے میدان، سواری کے لئے گھوڑے، نیزہ بازی، تیر اندازی کے موقعے اور تعلیم کے لئے مدرسے ملیں گے؟.....

بزرگ نے انتہائی محبت سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا! ہاں میرے بیٹے! ضرور ملیں گے.....

بچے نے پھر معصومیت سے سر اٹھا کر سوال کیا.....

اے میرے محسن! کیا وہاں کھانے کے لئے شوربے کا سالن، چاول، روٹی، حلال گوشت اور تازہ سبزیاں ملیں گی؟.....

بزرگ پھر بولے.....ہاں بیٹے یہ سب چیزیں تمہیں وافر مقدار میں میسر ہونگی.....

بچہ مطمئن ہو کر خاموش ہو گیا.....تھوڑی ہی دیر گزری کہ وہ پھر اچانک پوچھنے لگا.....

اے میرے محترم بزرگ! یہ بتائیے.....آپ مجھے جس جگہ لے جا رہے ہیں.....کیا وہاں مدینہ، مسجدِ نبوی، روضے کا سبز گنبد اور سنہری جالیاں ملیں گی؟

بزرگ پر یکدم کپکپی طاری ہو گئی.....آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے.....اور وہ افسوس سے کہنے لگے کہ نہیں بیٹا! ان

میں سے کوئی ایک چیز بھی وہاں نہیں ملے گی.....

یہ سنتے ہی لڑکا چھلانگ مار کر اپنی سواری سے نیچے اترا اور چلاّ کر کہنے لگا.....

جس جگہ یہ گنبد، یہ جالیاں، یہ مدینہ نہیں، وہ جگہ میرے کس کام کی.....اور پھر وہ سرپٹ واپس مدینہ کی طرف یہ چلاتا ہوا دوڑتا چلا گیا.....کہ وہ جگہ پھر میرے کس کام کی..... جہاں یہ گنبد، یہ جالیاں یہ مدینہ نہیں.....وہ جگہ پھر میرے کس کام کی.....''

ہر مسلمان کی طرح ہم بھی وہ کیفیت لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہیں کہ جب سنہری جالیوں پر آخری نگاہ ڈال کر آگے چلنے لگے تو جیسے زمین نے پاؤں پکڑ لئے، ہم پھر واپس جالیوں کی طرف لوٹ آئے، جی نہیں بھرتا تھا۔اور پھر ہمت جمع کر کے ہم نے خدا سے نجانے کیا کیا مانگ لیا.....انسان کا دل کمزور پڑ ہی جاتا ہے کہ اس در پر مانگا ہوا ضرور ملے گا.....ہم نے ہزاروں نعمتوں کے ساتھ دوبارہ ان سنہری جالیوں کا دیدار بھی مانگ لیا''.....

مسجد سے ہم بس اسٹیشن کی طرف آئے.....بمشکل جدہ کے لئے ٹکٹ کروائی اور اپنی بس میں آ بیٹھے.....رات بھر کے سفر کے بعد علی الصبح جب ہم جدہ میں سمندر کنارے سڑک پر بنے بس اسٹاپ پر اترے تو ظفر صاحب ہمارے منتظر تھے.....ان کے گھر سے سامان لے کر ہمیں آگے انگلستان کی طرف جانا تھا۔لیکن ہمارا دل بار بار ضمیر کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش کرتا تھا کہ آگے تو لندن و پیرس ہے.....مادام تساؤ اور مونالیزا ہے.....ایفل ٹاور اور ٹاور برج ہے.....آگے تو آکسفورڈ اور کیمبرج ہے.....کیا وہاں مکہ و مدینہ ملیں گے.....کیا وہاں گنبد، روضے کی جالی، کیا وہاں مدینہ ملے گا.....اور جب پوری شدت سے ضمیر کی عدالت سے یہ جواب آتا تھا کہ.....نہیں اے انسان..... بالکل نہیں.....ان میں سے کچھ بھی یورپ کی رنگینیوں میں نہیں ملے گا تو دل خود بہ خود کہہ اٹھتا تھا کہ پھر وہ جگہ ہمارے کس کام کی.....وہ جگہ ہمارے کس کام کی.....

.....

منزل بہ منزل

لو جی ،عمرہ ادا ہو گیا، گناہ بخشے گئے یا نہیں ، یہ خدا ہی جانے.....اچانک ہمیں اپنی ایک خود ساختہ بھول کا شدت سے احساس ہوا ۔دراصل ابھی ہمیں یورپ کی پاک صاف،اور خوبصورت سرزمین کی خاک بھی چھاننا تھا۔جبکہ سودمنداور منافعت بخش راستہ تو یہ تھا کہ ہم پہلے لندن یاترا کرتے ، پیرس کی گلیوں میں تلوے گھساتے اور پھر امن وسکون کے ساتھ سوئے حرم چلے آتے ۔کیونکہ اُن اعمال کا تناسب ''جو یورپ میں رہ کر عمل میں آنے تھے'' ہماری پوری زندگی کے گناہوں سے زیادہ ہوتا۔اور عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ ہم پہلے نوسو چوہوں کا شکار کرتے اور پھر گناہ بخشوانے اللہ کے گھر آتے ، خیر جو ہوا سو ہوا، ایک شکستہ دل مومن کو شیطان نے تھپکی دی اور ہم نے بھی زندہ ضمیر کو یہ کہہ کر خاموش کروادیا کہ خدا کی مرضی میں ہی اپنی رضا شامل کرنی چاہیئے ۔

جدہ ائرپورٹ بین الاقوامی معیار کا خوبصورت ائرپورٹ تھا، بیشتر ممالک سے مسافر اسی ائرپورٹ کے ذریعے سعودیہ کی سرزمین پر اترتے ہیں ۔ہمیں انتظارگاہ میں ڈیوٹی فری شاپس نظر آئیں تو ہم وقت گزاری کی خاطر ادھر کو چل دیئے ۔پیرس کی خوشبوئیں شیشے کی بوتلوں میں پیک ہو کر شیلف میں سجی ہوئی تھیں ۔کون جانتا تھا کہ ہم چند روز بعد اِسی پیرس کے باغ و بہار میں آوارہ گردی کرتے گلی کوچوں میں کھو جائیں گے ۔چلتے چلتے ہم زیورات کے حصّے میں داخل ہو گئے ۔اب یہ ہماری بدقسمتی سمجھئے کہ آج تک ہم صرافہ بازار نہیں گئے ۔اور اگر غلطی سے کبھی کبھار جانا بھی ہوا تو زیورات کی دکانوں میں بہرحال داخل نہ ہو پائے.....''زمانہ کالجی'' میں منہاج ظفر شہپرؔ،حبیب الرحمٰن دانشؔ،تنزیل آکاشؔ،جیسے دوستوں کے ساتھ جب بہاولپور کی سیر کو نکلنا ہوتا تھا تو ہم سینما گھر کی طرف سے ہوتے ہوئے بہاولپور کے پرانے بازاروں کی طرف نکل آتے تھے.....'' فرید گیٹ بازار بہاولپور کا ایک قدیم بازار ہے ۔اِس کا ایک حصہ صرافہ بازار کے طور پر جانا جاتا ہے ۔بازار کی چوڑائی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رش میں گزرتے ہوئے اگر سامنے سے کوئی ہرنی قلانچیں بھرتے ہوئے آجائے تو آس پاس نکلنے کی کوئی جگہ نہیں رہ پاتی اور وہ بیچاری بے بسی سے اپنی لمبی معصوم پلکیں جھپکا کر راستہ دینے کی درخواست کرتی اور دوست یار پائنچے اوپر اٹھا کر سانس اندر کھینچتے اور افریقہ کے فاقہ کش حبشیوں کی مانند اپنی چیتے ایسی کمر بازار کے دیوار کے ساتھ سختی سے لگا کر کھڑے ہو جاتے مگر پھر بھی غیر اتفاقی طور پر اگر ہرن کے لبادے کا کوئی حصہ دوستوں کے فاقہ زدہ جسم سے مَس ہو جاتا تو وہ ہرن اچانک سر موڑ کر ایسی تیکھی نظروں سے گھورتی کہ دوست لوگ نظروں کی تاب نہ لا کر وہیں موم کی طرح شرم سے پگھل جاتے ۔ہرن پھر سے چھلانگ بھر کر آگے بڑھ جاتی جبکہ دوست پیچھے کھی کھی کر کے ہنس پڑتے.....ویسے حقیقتاً یہ صرف اپنے دوستوں کا ہی فرضی قصہ ہے لہٰذا ہمیں شاملِ تفتیش نہ کیا جائے.....مقصد صرافہ بازار سے انجان ہونا ثابت کرنا تھا.....

اب ہم جوزیورات کی طرف متوجہ ہوئے تو کاؤنٹر مین نے حد درجہ اخلاق سے پوچھا کہ کس قسم کا زیور چاہئے۔ہم انگوٹھی، چوڑی، کوکا، بالی، پائل کے ناموں سے تو واقف تھے، شکلیں بھی جانی پہچانی تھیں مگر کھرے کھوٹے کی تمیز کرنے کی صلاحیت ہم جیسے بے ذوق انسان میں نہ تھی۔سو آگے کو چل دیئے۔قسمت سے کتابوں کے شیلف سے ہمیں اردو کا ایک جریدہ دستیاب ہوا تو ہم نے مقررہ داموں خرید لیا، حالانکہ ہمیں بیش قیمت پر رسالہ خریدنے کے لئے خود کو راضی کرنے پر خاصی تگ ودو کرنی پڑی تھی۔اتنے میں جہاز پر پہنچنے کا اعلان ہو گیا۔ہم جہاز میں داخل ہوئے اور اپنی سیٹ پر اُس دیہاتی کی مانند قبضہ جما کر بیٹھ گئے جو اپنے سامان کی گٹھڑی بغل میں دبائے سیٹ کو زور سے پکڑ کر بیٹھا ہوتا ہے، مبادہ یہ آخری سیٹ ہے اور اُس سے کسی بہانے چھین ہی نہ لی جائے۔شوخ نظر عربی ائر ہوسٹس نے بمشکل بیگ ہمارے ہاتھوں سے نکال کر اوپر کے خانے میں ٹھونسا اور کمر لچکا کے آگے کو چلتی بنی۔جہاز نے اڑان بھری تو پورے جہاز میں ہلچل مچ گئی۔کسی کو نوافل پڑھنا یاد آئے تو کوئی باتھ روم کی جانب لپکا۔کوئی اپنے بکھرے ہوئے بچوں کو سمیٹنے لگا اور باقی دوسرے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔جن میں ایک انگریز جوڑے کی مصروفیات قابلِ غور ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ دید بھی تھیں۔ہم ادھر ادھر تانکا جھانکی کر کے اپنا پاکستانی حق استعمال کرنے لگے۔سکرین پر کوئی انگلش فلم چل رہی تھی۔اتنے میں کھانا پیش کر دیا گیا۔ابلی ہوئی سبزیاں، ابلا ہوا گوشت، اور شاید ابلی ہوئی سویٹ ڈش، ہم جیسے مرچ مصالحوں کے عاشق پاکستانی کو تو ذرا نہ بھایا۔کوک منگوائی اور چسکیاں لے لے کر پینے لگے۔خوش قسمتی سے ہمیں کھڑکی کے ساتھ والی ہماری پسندیدہ سیٹ ملی تھی۔ایسے موقع پر ہمیں کبھی کبھی یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ ہم ابھی وہی پانچ سال کے بچے جیسے ہیں جو کھڑکی والی سیٹ حاصل کرنے کے لئے پرجوش ہوتا ہے اور باہر کے نظارے دیکھ کر خوشیوں سے تالیاں بجاتا ہے۔لیکن قدرت کے کارنامے دیکھ کر بچوں کی فطری سچائی ومعصومیت کے ساتھ خوشی کا اظہار کرنا اور قدرت کی تعریف کرنا بھی خالق سے الفت کا ایک تقاضا ہے۔خاصا لمبا سفر تھا، ہم آنکھیں موند کر نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔صحیح معنوں میں آنکھ اس وقت کھلی جب ائر ہوسٹس نے آ کر جگایا کہ لندن آنے والا ہے۔حلیہ درست کر لو۔اُس نے اتنے پیار سے جگایا کہ دل دوبارہ سونے کو مچلنے لگا، تاہم موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم نے شرافت اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی۔جہاز لینڈ کر چکا تو مسافروں میں کھلبلی مچ گئی لیکن ہم آرام سے ناک کھڑکی سے چپکائے باہر کا نظارہ کرتے رہے کہ اب لندن دور نہیں ہے۔شام کے سائے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بے تاب نظر آتے تھے۔سب سے آخر میں بیگ اٹھائے ہم تھکی ہاری آنکھوں کے ساتھ آگے کو چلنے لگے اور آخر کار راہداری میں داخل ہو گئے.....

کسی بھی ملک میں داخلے کے وقت سب سے دقت آمیز مرحلہ امیگریشن کے پل صراط سے گزرنا ہوتا ہے۔راہداری ختم ہوئی اور ہم ائر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تو سامنے مسافر قطار در قطار امیگریشن حکام سے نبرد آزما نظر آئے۔اتنی طویل فلائٹ کے بعد اتنی لمبی قطاریں دیکھیں تو نفسیاتی طور پر مایوسی چھا گئی کیونکہ انتظار دنیا کی سب سے ظالم شے ہے اگرچہ اس سے شدید قسم

کی جذباتی وابستگی قائم نہ ہو۔ہم چھان بین کے بعد غیر ملکی مسافروں کی قدرے کم افراد والی ایک قطار میں جا کھڑے ہوئے۔ ہر طرف بھانت بھانت کے رنگوں والے لوگ نظر آ رہے تھے۔ لمبے لمبے سفید کالے چغے پہنے عربی و افریقی مسافر بھی اور آدھے لباس میں ملبوس گوری بیبیاں بھی، پاکستانی مسافر بھی کثرت سے نظر آئے۔ خدا خدا کر کے آدھے گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ہماری باری آئی تو ''یا خدایا نصیب'' ہماری قطار کی افسر نے کسی ضروری کام کے تحت ساتھ والی بی بی کے کان میں کھسر پھسر کی اور ہم سب سے ایک سوری داغ کر چلتی بنی۔ ساتھ والی بی بی نے ہماری لائن کو بھی ساتھ ساتھ بھگتانا شروع کر دیا۔ ہماری باری آئی تو سوچا کہ ''ویزہ چیک ہوتے ہوئے دیکھیں یا ویزہ چیک کرنے والی کو دیکھیں'' یہ عقدہ حل کرنے میں محو تھے کہ آواز آئی.....

''پاکستانی.....ہوں!!!''

پاسپورٹ چیک کرتے ہوئے وہ سر کو جنبش دیئے بغیر نظریں اٹھا کر ہمارے چہرے کا موازنہ پاسپورٹ پر لگی تصویر کے ساتھ کرنے لگی۔

''کس غرض سے آئے ہو؟''

''آوارہ گردی کی غرض سے''

''کہاں ٹھہرو گے؟''

تمنا تو یہ تھی کہ کہہ ڈالیں حضور! آپ کی میزبانی کے خواہاں ہیں مگر ہونٹوں پر آئے الفاظ کو رول بیک کیا اور بولے.....

''ہمارے ایک چچا جو ہمارے والد کے حقیقی بھائی ہونے کی نسبت ہم سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، اُن کے ہاں قیام کا ارادہ ہے۔''

وہ سٹپٹائی اور قدرے برہم ہوگئی۔ ''میں تو سوچ رہی تھی شاید گدھے گھوڑے بیچ کر کسی قدیم سرائے میں جا کر سو رہو گے''

''ہم بے بسی سے تلملا کر رہ گئے''.....کیا کرتے.....کہ صنفِ نازک کو پلٹ کر جواب دینا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ خاص کر جب وہ خوبصورت بھی ہو اور فیصلہ کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔

''ساتھ کتنی نقدی لائے ہو''

''آوارہ گردی کے کچھ سستے سامان اور چند کتابوں کی کل مالیت ملا کر چند پاؤنڈ وہ بھی اگر کسی وقت اِس خزانے کی نیلامی کا اندیشہ ہو تو، اِس کے علاوہ چند سو ڈالر''

اُس نے حقیرانہ انداز میں ہمارے چند سو ڈالر والی اصطلاح کو ہوا میں اڑایا اور بولی ''چند سو ڈالر سے انگلینڈ میں کیا دیکھو گے''

ہم نے اپنی امارت کا محل ڈھیر ہوتے دیکھا تو گویا ہوئے ''انگلینڈ نہیں دیکھیں گے تو کیا کسی سرائے میں گھوڑے باندھ کر سو رہیں گے''.....

اپنے کہے ہوئے الفاظ ہماری زبان سے سن کر اُس کی آنکھوں میں شوخی سی بھر آئی ،ترچھی نظروں سے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور پاسپورٹ کا اندراج کرنے میں مصروف ہوگئی۔ چند لمحے گزر گئے.....

''وش یو گڈ لک''، مسکرا کر اس نے پاسپورٹ پر مہر ثبت کی اور پاسپورٹ ہمیں تھما کر انگلینڈ دیکھنے کا پروانہ عطا کر دیا۔

سامان لینے کے لئے گھومتی ہوئی پٹی کی طرف بڑھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس لڑکی کے قہقہے ہمارے کانوں میں گونج رہے ہوں اور لوگوں کی نظریں ہمارے تعاقب میں ہوں۔

سامان لے کر باہر نکلے تو پاشا صاحب ہمارے منتظر تھے۔ پاشا بھائی پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ برمنگھم میں رہتے ہیں۔ دعا سلام کے بعد ہم بمع ساز وسامان لفٹ میں داخل ہو گئے۔ اور اپنے مطلوبہ فلور پر اتر گئے۔ سامنے وسیع پارکنگ ایریا تھا۔ یہ غالباً پارکنگ لاٹ کی دوسری یا تیسری منزل تھی۔ سامان گاڑی میں لادا اور سیٹ میں دھنس کر بیٹھ گئے۔ ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلے تو بے حد مسرت کا احساس ہوا کہ اب ہماری آوارہ گردی کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ دراصل لندن دیکھنا ہماری ایک دیرینہ خواہش تھی۔ اور کیوں نہ ہو کہ ہر نئی اور مقبول و معروف جگہ کی سیر کرنا کسی بھی سیاح کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ شام کا دھندلکا پھیلا ہی چاہتا تھا۔ شہر میں روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ آسمان قدرے ابر آلود تھا۔ فضا میں خنکی کا عنصر رات کی آمد کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پاشا بھائی خوبصورتی کے ساتھ گاڑی پر ہجوم ٹریفک سے جلد از جلد نکالنے میں کامیاب رہے۔ اور اب گاڑی موٹروے پر فراٹے بھر رہی تھی۔

اتنے میں پاشا بھائی کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا.....

''سفر کیسا رہا''.....

''ایک دم فرسٹ کلاس''.....

''امیگریشن میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی''.....

''نہیں،.....ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، کافی مشکل مرحلہ تھا مگر خوبصورتی سے طے ہو گیا''.....

''غلط بول گئے''.....

پاشا صاحب نے ہماری درستگی فرمائی.....

''یوں کہو کہ خوبصورت مرحلہ تھا کافی مشکل سے طے ہوا''.....

''اور ہمارے پاس حفاظتی بحث کے لئے کوئی معقول جواز موقع برمحل موجود نہ تھا''.....

پاشا بھائی پاکستان میں تمام عزیز و اقارب کا حال احوال دریافت کرنے لگے۔ فلائٹ سے قبل رات بھر مدینہ سے جدہ کے سفر اور پھر جدہ سے لندن آٹھ نو گھنٹوں کی مسلسل پرواز نے جسم پر تھکاوٹ کے اثرات چھوڑ دیئے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے کے تیز سفر کے

بعد گاڑی برمنگھم میں داخل ہوئی۔ ہمارا قیام ہمارے چچا جان ''اورنگزیب خان'' کے گھر پر تھا۔سامان وغیرہ اتار کر تمام احباب سے ملاقات ہوئی، کھانا کھایا اور پھر سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔خواب میں ائرپورٹ والی لڑکی کا طنز یاد آیا کہ گدھے گھوڑے بیچ کر کسی قدیم سرائے میں سو رہو گے اور ہم نے سینہ تان کر کہا، دیکھ لو آ کر.....خدا کی مہربانی سے کسی سرائے کی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر نہیں بلکہ نرم و ملائم بستر پر سونا نصیب ہو رہا ہے۔مگر اُس لڑکی کے قہقہے ابھی تک کانوں میں گونج رہے تھے اور لوگوں کی نظریں ہمارے تعاقب میں تھیں۔

.....

برمنگھم ایک گاؤں ہے

برمنگھم برطانیہ کے بڑے اور مشہور شہروں میں سے ایک ہے۔ اِس کی شہرت کا نمایاں پہلو آرٹ ہے۔ شہر کی آرٹ گیلریوں میں ہر وقت کسی نہ کسی نامور مصوّر کے فن پاروں کی نمائش لگی رہتی ہے۔ اِس کی شہرت کی دوسری وجہ برمنگھم یونیورسٹی ہی تو ہے جہاں ہمارے وطن عزیز کے بیشتر طالبعلم اور افسران اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جاتے ہیں۔ برمنگھم میں پاکستانی خاندانوں کی بہتات ہے۔ بلکہ بریڈفورڈ، مانچسٹر کے ساتھ ساتھ اِسے بھی منی پاکستان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس گھر میں ہمیں قیام کرنے کا موقع ملا اِس کے دائیں بائیں دونوں گھر بھی ہمارے عزیز و اقارب کے تھے۔ اِن گھروں کے مقابل سڑک کے پار ایک خوبصورت لیکن چھوٹا سا گرجا گھر تھا جو ہم نے اپنے قیام کے دوران ایک مرتبہ بھی کھلا نہیں دیکھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اکثر چرچ ویران پڑے رہتے ہیں اور جس گرجا گھر میں عوام کا آنا جانا ختم ہو جائے یا کم پڑ جائے تو اُس کو بیچ دیا جاتا ہے۔ پاکستانیوں کے علاوہ سکھ اور ہندوستانی چہرے بھی شہر میں بکثرت نظر آئے۔ ایک بات جو ہم نے وہاں ہندو، مسلم (پاکستانی مسلم) اور سکھ عوام سے ملاقاتوں کے دوران محسوس کی کہ وہ روایتی حریف پن جو ایک دوسرے کے لئے پاکستان اور انڈیا میں رہ کر عوام کے دل میں پایا جاتا ہے، اُس منفی جذبے کا کسی حد تک فقدان ہے۔ انڈین ملتے ہیں تو دوستوں کی طرح دل کھول کر ملتے ہیں اور سردار لوگ ملاقات کرتے ہیں تو باقاعدہ جوش و جذبے کے ساتھ گلے لگاتے ہیں، پیٹھ پر تھپکی دیتے ہیں، بات بات پر ہنسی مذاق کرتے ہیں اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر اپنی محبت اور حسِ مزاح کا ثبوت دیتے ہیں۔ لکھنے والے بجا لکھتے ہیں کہ خالصہ (سکھ) دنیا کی مخلص ترین اور مہمان نواز قوم ہے جو دنیا کے ہر کونے میں مل جاتی ہے اور دل و جان سے آپ کی مدد کے لئے تیار رہتی ہے یہاں تک کہ آپ کی محبت میں جان تک نچھاور کر سکتی ہے۔ برمنگھم لاکھوں کی آبادی کا شہر ہے۔ نائٹ لائف بھی یہاں کی خوب ہے۔ سٹار سٹی رات کے وقت جگمگ کرتا ہے۔ دیکھنے کے لئے مقبول و معروف مقامات اور خوبصورت جگہیں اپنی مثال آپ ہیں۔ ہر چند کہ آپ کو بہترین وقت گزارنے کے لئے ہر قسم کی تفریح میسّر آ جاتی ہے لیکن لندن والے کہتے ہیں کہ ''برمنگھم ایک گاؤں ہے''۔ اِس غیر معروف کہاوت کی کوئی باقاعدہ منطق سمجھ میں نہیں آتی لیکن جب ہم برمنگھم کے بعد لندن دیکھتے ہیں یا لندن سے آ کر برمنگھم دیکھتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ برمنگھم ایک گاؤں ہے۔ واقعی اِس قول کی کوئی باقاعدہ منطق سمجھ میں نہیں آتی۔

.....

آرٹ گیلری عطیہ پر چلتی ہے

کیونکہ ہم اِس شہر میں نئے پنچھی تھے اِس لئے آغازِ شہر گردی میں ''محمود خان زاہد'' جو رشتے کے لحاظ سے ہمارے چچا جان ہیں، اُن کی رفاقت مستعار حاصل کرنا پڑی۔ اُن کی صحبت کچھ اتنی بری بھی نہ تھی کہ ہر بات کو مذاق بنانے اور دلائل دے کر اپنی بات سچ ثابت کرنے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ قابلِ فخر خوبی اُن کی شخصیت میں اِس لئے بھی شامل ہے کہ وہ ماضی میں ایک کامیاب وکیل رہ چکے ہیں۔ اور وکالت کا وہ زمانہ اب ماضی کی گرد آلود کتاب میں کہیں دھندلا گیا ہے کیونکہ پاکستانی عدالتی نظام سے تنگ آ کر انہیں وکالت کا شعبہ چھوڑنا پڑا اور آخر کار پردیس اُن کی قسمت ٹھہرا۔ محمود صاحب ہمارے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ برمنگھم میوزیم و آرٹ گیلری سٹی سینٹر کے نزدیک واقع تھی۔ گھر سے بذریعہ کار کوئی پندرہ منٹ کا فاصلہ ہو گا۔ اجلا اجلا موسم تھا جو آنکھوں کو طراوت اور ٹھنڈک بخش رہا تھا۔ اِس کے علاوہ محمود صاحب کے لطیفوں نے بھی موسم کی دلکشی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ اِس سے پہلے کہ ہم ''پندرہ منٹ'' کا سفر کر کے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتے انہوں نے ایک جیتا جاگتا لطیفہ سنایا جو کہ اُن کی ایک مایہ ناز آپ بیتی ہے۔

کہنے لگے، ایک دن میں مارکیٹ سے تھکا ہارا غروب کے وقت گھر پہنچا تھا، بدقسمتی سے پچھلے دو دن سے بوجوہ سفر رات کو سونہ سکا تھا، اپنا سامان اِدھر اُدھر پھینکا اور بستر پر دراز ہوا۔ ابھی خوابِ خرگوش کے مزے لینے ہی لگا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ چار و ناچار دروازے پر جانا پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ درمیانی عمر کے دو درویش صفت افراد ہاتھوں میں رسیدی بک پکڑے کھڑے ہیں۔ میں نے اُن سے آمد کی وجہ دریافت کی تو وہ یوں گویا ہوئے۔

''محترم دوست، ہماری کمیٹی پاکستانی کمیونٹی کی خواہشات وضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسجد کی دیکھ بھال کے لئے ایک فنڈ ترتیب دے رہی ہے۔ اِس سے قبل بھی کئی پاکستانیوں نے مالی تعاون فرمایا ہے، ہماری گذارش ہے کہ آپ بھی اِس نیک منصوبے میں کچھ حصہ ڈالیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے حواس پر غصہ چھا گیا۔ بات کوئی ایسی غصے والی نہ تھی لیکن دراصل کچھ تھکاوٹ کا اثر تھا اور کچھ وقت کی نزاکت تھی کہ شام ہوئی چاہتی تھی۔ پھر یہ چندوں کا سلسلہ پاکستان سے یہاں برطانیہ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے جیب سے بیس پاؤنڈ کا نوٹ نکالا اور اُن کو عنایت کر دیا۔ انہوں نے کاغذ قلم سنبھال کر پوچھا.....

''جناب آپ کا نام۔۔۔۔۔؟''.....

میں بے حد اطمینان سے بولا۔۔۔''رام داس''.....

ان کا ماتھا ٹھنکا ''پوچھا آپ انڈین ہیں''.....

میں پھر بولا ''میں رام داس''.....

یہ سننا تھا کہ انہوں نے پیسے فوراً لوٹائے اور پتلی گلی سے نکل گئے کہ ایک ہندو سے مسجد کی تعمیر کا عطیہ کیونکر لیا جا سکتا ہے۔اُن کا اِس قدر شدت سے پلٹنا دیکھ کر میرا ہنسنا اِس قدر شدید تھا کہ ساری خفگی اور تھکاوٹ دور ہوگئی۔

یہ لطیفہ یا لطیفے جیسی کوئی چیز تھی تو ہم نے جبر کر کے سنی اور اتنے میں سٹی سنٹر آ گیا۔محمود صاحب گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے لوٹے تو ہم میوزیم میں داخل ہوئے۔ بنیادی طور پر ہم سائنس کے طالبعلم ہیں۔آرٹ سے ہمارا تعارف اور تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔آرٹ سے ہماری دلچسپی اِس حد تک رہی ہے کہ اگر کبھی دو چار لکیریں کھینچنے کی کوشش کی تو بلی کی بجائے کتا بن گیا اور لڑکی کی تصویر بنانا چاہی تو پہلوان لڑکا بن گیا۔میوزیم و آرٹ گیلری صبح ۹ بجے کھلتی ہے۔میوزیم میں داخلے کی کوئی باقاعدہ ٹکٹ نہ تھی۔میوزیم مختلف حصوں پر مشتمل تھا۔ایک حصے میں قدیم نوادرات، نقش ونگار کیے برتن، اور زیورات موجود تھے۔میوزیم کا بڑا حصہ آرٹ گیلری کے طور پر موقوف کر دیا گیا تھا۔ جہاں قدیم مصوروں سے لے کر عصرِ حاضر کے نامور مصوروں کے شاہکار آویزاں تھے۔ چلتے چلتے ہم نے ایک شیشے کی بند میز میں انسانی ممی دیکھی۔ انسانی ممی تو دیکھنے کو ملتی ہے لیکن ہماری توجہ کا مرکز چھوٹی چھوٹی دو ممیاں تھیں۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ بلی اور سانپ کی ممیاں ہیں۔بیچاری بلی کے رہے سہے ڈھانچے کو گول مول کر کے گیند جیسی شکل دے دی گئی تھی۔ بیچاری نجانے کتنے کرب میں مبتلا ہوگی۔اور اب بھی شاید رات کے کسی پہر بلی کی سسکی بھری میاؤں میاؤں ہال میں گونجتی ہوگی اور میوزیم کے چوکیدار کو ہراساں کر دیتی ہوگی۔اِس کے علاوہ ہم نے جہاں قدم رکھا ہمیں تصاویر اور پینٹنگز کی کثرت نظر آئی۔یسوع مسیح کی تصاویر، نیک مریم کی تصاویر، شہنشاؤں کی دادِ عیش دیتی ہوئی پینٹنگز جن میں پریمیوں، اور برہنہ ونیم برہنہ جسم، چھلکتے جام، مہکتے انداز، لڑکھڑاتے قدم اور ماضی کے زمینی خداؤں کی عیش وعشرت کو رنگوں میں سمو دیا گیا تھا۔کیونکہ زندگی میں آرٹ گیلریاں کم ہی دیکھنا نصیب ہوئی تھیں اور فطری طور پر بے باک تصاویر کو ہم خاص طور پر دیکھ رہے تھے۔ یہ جانچنے کے لئے کہ بادشاہوں کے رہن سہن کا ذکر جو کتابوں میں بڑے بے باک الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔کیا واقعی درست ہے۔دیکھنے والے سمجھتے جاتے تھے کہ ہم عینک گھر بھول آئے ہیں۔ایک مرتبہ ہمیں طنزاً ایک انگریز کی جانب سے عینک استعمال کرنے کی پیشکش بھی ہوئی اور ہم نے میزبان کا دل رکھنے کے لئے یہ پیشکش قبول بھی کی کہ نزدیک کی نظر والی عینک سے چیزیں زیادہ قریب نظر آتی ہیں۔اور آنکھیں تصویر کے ساتھ چپکانی نہیں پڑتیں کہ خوامخواہ بدنامی کا اندیشہ ہوتا ہے۔میوزیم میں بچوں کے لئے بھی ایک حصہ مخصوص کیا گیا تھا۔انتہائی قدیم زمانے کے ریڈیو کا ایک نمونہ پڑا تھا جو سائز کے اعتبار سے کسی جیٹ طیارے کا انجن لگتا تھا۔ریڈیو کا ایک بڑا سا ہینڈل تھا جسے زور سے گھمانے سے ریڈیو میں زندگی کی رمق نظر آتی تھی۔میوزیم کے باقی حصے جو کہ صرف خانہ پری کے طور پر سجائے گئے تھے، سرسری طور پر دیکھنے کے بعد ہم واپس کو ہو لئے۔ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ میوزیم کی کوئی باقاعدہ ٹکٹ نہیں تھی لیکن انتظامیہ نے داخلے اور واپسی کے

دروازے کے نزدیک ایک بڑا سا ڈبہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ میوزیم کے لئے آپ ذاتی طور پر اگر کچھ عطیہ دینا چاہیں تو اِس ڈبے میں ڈال سکتے ہیں اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اُس ڈبے میں ہر دوسرا شخص کچھ نہ کچھ نقدی ڈال رہا تھا۔ یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ حکومت کی جانب سے آرٹ گیلری اور میوزیم کو ماہانہ یا سالانہ مخصوص فنڈ ضرور ملتا ہوگا لیکن ہماری دانست میں ''ازراہِ مذاق ہی سہی'' یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''برمنگھم میوزیم و آرٹ گیلری عطیہ پر چلتی ہے'' جبکہ یہ بھی ماننا پڑا کہ یورپی ممالک میں لوگ بذاتِ خود فلاحی کاموں میں حصہ ڈالتے ہیں کہ اُن کے ہاں گھر گھر جا کر اور سڑک پر گاڑی رکوا کر زبردستی چندہ مانگنے کی رسم موجود نہیں.....آرٹ گیلری سے باہر نکلے تو سورج پورے آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔آرٹ گیلری کے مصنوعی ماحول سے نکلنے کے بعد سورج کی قدرتی روشنی آنکھوں کو بے حد بھلی محسوس ہوئی اور جسم تر و تازہ ہو گیا۔ ہماری اگلی منزل سنٹرل لائبریری تھی جو کہ محض چند قدموں کے فاصلے پر واقع تھی۔سنٹرل لائبریری شہر کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔اِس لائبریری کی عمارت پانچ یا چھ منزلوں پر مشتمل ہے۔اِس کے علاوہ شہر بھر میں ہر ٹاؤن اور ہر علاقے کی اپنی چھوٹی لائبریری ہے۔گراؤنڈ فلور پر برگر، فاسٹ فوڈ، کافی اور دیگر اشیاء کی دوکانیں تھیں۔ ہر طرف لوگوں کی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ہم نے لائبریری کی ہر منزل دیکھی اور بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا کہ لائبریری میں ہر مضمون کا الگ شعبہ موجود تھا۔ جو بھی کتاب مطلوب ہو، آپ شیلف سے نکال کر میز پر جا بیٹھئے اور خاموش، پرسکون ماحول میں کتاب کے صفحات میں غرق ہو جایئے۔اگر ممکن ہو اور طبیعت و حالات اجازت دیں تو وقتاً فوقتاً سامنے بیٹھی حسینہ سے آنکھ بھی لڑاتے رہیے۔کتابیں ساتھ لے جانے کی اجازت اُن افراد کو ہوتی ہے جن کے پاس لائبریری کارڈ موجود ہو۔ایک کارڈ پر زیادہ سے زیادہ آٹھ کتابیں ایک مہینے کی معینہ مدت تک کے لئے حاصل کی جا سکتی ہیں۔اِس کے علاوہ ہر منزل پر فوٹو اسٹیٹ مشینیں، کمپیوٹر اور دیگر مشینیں بھی موجود تھیں۔لائبریری میں پاکستان اور اردو ادب پر مشتمل کتابیں نظر آئیں تو ہمارا منتظر دل تعجب، فخر، غرور اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے لیس ہو کر باغ باغ ہو گیا۔لائبریری دیکھ چکے تو واپسی کی راہ لی۔سورج ابھی تک سینہ تانے آسمان پر حکمرانی کر رہا تھا۔

.....

اپنی زبوں حالی پر ہم ناز کریں یا فکر

صاف آسمان ہو اور سورج پوری شان و شوکت سے چمک رہا ہو تو یہ سماں گوروں کے لئے عید کا پیغام ہوتا ہے۔ دھوپ نامی مغرور حسینہ شاذ و نادر ہی لوگوں کو اپنا مُکھ دکھاتی ہے۔ اور سال کا بیشتر حصہ نئی نویلی دلہن کی مانند نقاب اوڑھے شرماتی لجاتی رہتی ہے۔ سامنے ایک بڑا سا فوارہ لگا تھا۔ اِس کے علاوہ فوارے سے چند گز فاصلے پر قوس کی صورت میں اوپر تک زینے بنے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ جن میں بچے جوان بوڑھے سب ہی شامل تھے زینوں پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ ہر کسی نے اپنی الگ دنیا بسائی ہوئی تھی۔ اکثر نوجوان لڑکے لڑکیاں سر جوڑے راز و نیاز میں مصروف نظر آتے تھے۔ یہ گورے بھی عجیب لوگ ہیں۔ فلمی سین سرِ عام اپناتے ہیں۔ گلیوں کوچوں اور بس اسٹاپ پر کھڑے اداکاریاں کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم غیر ارادی طور پر سوچوں کے دھارے میں بہہ گئے کہ ایسی قالین صفت شاہراہوں کا کیا فائدہ جن کے کنارے لوگ فحش حرکات کرتے ہوئے چلیں، اِن تفریح گاہوں کا کیا فائدہ جو خاندان کے لڑکے لڑکیوں کی بے راہروی کی بنیاد ہوں، جہاں وہ اپنے ہی کھیل کھیلنے لگیں۔ اِن لائبریریوں اور آرٹ گیلریوں کا کیا فائدہ کہ لوگ تاریخ پڑھنے کی بجائے اپنی داستانیں رقم کرنے لگیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک ابھی ''اتنی'' ترقی نہیں کر گیا جس قدر ہمارے حکمران چاہتے ہیں یعنی ہم پر مغربی معاشرے کی چھاپ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ایمان ہے، غیرت ہے، اگر ہماری ساٹھ فیصد عوام دنیاوی آرائشوں سے محروم ہے تو کوئی شک نہیں کہ دنیاوی دولت ہی آدمی کو اخلاقیات اور انسانیت کے دائرے سے باہر لا کھڑا کرتی ہے۔ نتیجے میں ایک ہی مصرعہ ہماری زباں سے ادا ہو سکا کہ.....

''اپنی زبوں حالی پر ہم ناز کریں یا فکر''

خیالات کی دنیا سے واپس لوٹے تو ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ لوگ ایک گانا گانے والے گروپ کے گرد جم گھٹا بنائے کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ گانے اور ناچنے والے مرچیں چبا کر اپنے ''بے مثال'' فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے''۔ محمود صاحب گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔

ہم نے چاروں طرف ایک ''بھرپور'' نظر ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے..... ہماری اگلی منزل گھر کا کچن تھا۔

.....

مس جولی اور سٹی سینٹر

ہاں! تو مس جولی آپ کیا فرما رہی تھیں؟ ہم نے ساتھ بیٹھی دوشیزہ سے پوچھا.....

آج اتوار تھا اور ہم اپنی بیقرار فطرت سے مجبور ہو کر آوارہ گردی لئے نکلے تھے۔ برمنگھم میں ہمارا قیام لگ بھگ پندرہ دنوں کے لئے تھا اور برمنگھم کو دو تین دن میں مکمل طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ لہذا ہم دو تین روز آرام کرتے اور پھر کہیں گھومنے نکل جاتے.....

''خوب گزر رہی تھی خود فریبی میں''.....

جیسا کہ ہم اوپر یہ لکھ چکے ہیں کہ سٹی سینٹر محمود صاحب کے گھر سے محض پندرہ منٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ ایک دن ہم پیدل ہی سٹی سینٹر کو ہو لئے۔ سٹی سینٹر کے بارے میں یہ تو مکمل اندازہ نہیں کہ اپنے نام کے اعتبار سے یہ شہر کے وسط ہی میں واقع ہے لیکن اِس بات کا اندازہ خوب ہے کہ یہ علاقہ شہر کا سب سے مصروف مقام ہے۔ بھانت بھانت کے کیسینوز، بار، ڈسکو، ریسٹورنٹ، ون پاؤنڈ شاپس، گارمنٹ مارکیٹس، اِس کے علاوہ روزمرہ کی تمام ضروری اشیاء کی دوکانیں موجود تھیں۔ ایک کھلی جگہ پر بازار لگا نظر آیا۔ جیسے ہمارے ہاں جمعہ بازار (ملتان)، ہفتہ بازار (کراچی)، رمضان بازار اور اِس کے علاوہ بھانت بھانت کے بازار (لاہور وغیرہ میں) لگتے ہیں ایضاً یہاں بھی دوکاندار چھٹی والے روز علی الصبح اپنی اشیاء کا ٹوکرا لے کر ایک مخصوص مقام کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں۔ اپنی سہولت کے لئے ہم نے اِسے اتوار بازار کا نام دیا ہے۔ کیونکہ اس روز اتوار تھا۔ اتوار بازار میں مفید جگہ حاصل کرنے کے لئے جلد سے جلد پہنچنا لازمی ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ اپنے گھر کا پرانا قابلِ استعمال سامان اونے پونے داموں بیچ رہے ہوتے ہیں۔ سٹی سینٹر میں ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے ہم پھر سنٹرل لائبریری کے فوارے والی جگہ پہنچ گئے۔ اور آرام کرنے کے لئے جونہی زینے پر بیٹھے تو ساتھ بیٹھی بی بی سے ''خواہ مخواہ'' راہ و رسم بڑھانا چاہی۔ اور غیر اتفاقی طور پر یہ کوشش خوبصورت گفتگو کا سلسلہ اختیار کر گئی۔

ہاں! تو مس جولی آپ کیا فرما رہی تھیں؟

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہاں سب کو شخصی آزادی حاصل ہے۔ وہ کسی پروفیسر کی طرح بولی ''ہر بالغ فرد اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے''

''ہوں''.....تو یہ معاملہ اپنی اپنی ڈفلی اپنے اپنے راگ والا ہے۔ ہم ایک زوردار ہوں کے ساتھ بڑبڑائے.....

یہ ''ڈفلی'' کیا ہوتی ہے۔ وہ چمک کر بولی

''ڈفلی''، ہم انگریزی کا کوئی مناسب سا لفظ سوچنے لگے۔ اور پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولے ''وہی ڈفلی جس سے کٹھ پتلیوں کو نچایا جاتا ہے''، جیسے معصوم لڑکیاں مردوں کے اشاروں پر ناچتی ہیں.....

''جولی'' والدین سے الگ ایک فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ پوچھا کہ تم اکیلی کیوں ہو۔ کیا تمہارا کوئی چاہنے والا نہیں؟
اُس کے لبوں پر معنی خیز ہنسی امڈ آئی اور وہ آنکھوں کے سامنے چھائی زلفوں کو پیچھے لہراتے ہوئے بولی ''دراصل میں بار بار لڑ کے بدلنے کے حق میں نہیں ہوں'' جیسا کہ عموماً لڑکیاں کرتی ہیں۔ فی الحال مجھے دو چار سال تک پیار محبت کا کوئی شوق نہیں۔
تمہاری عمر کیا ہے؟ ہم نے بے ساختہ پوچھا.....
لڑکیوں سے اُن کی عمر نہیں پوچھا کرتے وہ بھنویں سکیڑ کر بولی.....
ہم نے گھڑی دیکھی تو واپسی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
سنو! اُس نے پیچھے سے آواز لگائی.....سورج کی روشنی آنکھوں میں پڑنے کی وجہ سے اُس نے آنکھوں پر ہاتھ سے ایک چھجا سا بنایا ہوا تھا.....آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی تم برمنگھم میں کتنے دن کے لئے ٹھہرے ہو؟
معلوم نہیں.....ہم نے کندھے اچکا کر جواب دیا.....
وہ بولی.....میں ایک ٹورسٹ گائیڈ ہوں۔ اگر تم میری خدمات حاصل کرلو تو شاید برمنگھم کو زیادہ قریب سے دیکھ لو گے۔
کتنے قریب سے؟.....بے ساختہ ہماری زبان سے نکلا.....اِس بے ساختگی میں کچھ ذاتی شرارت بھی شامل تھی۔
تم پٹڑی سے اتر رہے ہو۔ وہ بے اختیار جھینپ گئی.....
ہمیں تو ساری دنیا دیکھنی ہے۔ یہ بے ضرر سی زندگی اَن دیکھے خطوں کی خاک چھانتے گزر جائے گی۔ تم اگر سارے سفر کے لئے ہماری گائیڈ بننا چاہتی ہو تو ہم سفر بھی بنو گی اور ہمارے ملک میں ہم سفر اسے کہتے ہیں جو زندگی کا ساتھی ہو۔ بولو معاہدہ پکا؟
اوہ شریر لڑکے.....وہ مسکرائی اور منہ موڑ کر گھٹنوں میں چھپا لیا.....
جبکہ ہم نے واپسی کی راہ لی.....

.....

برطانیہ میں بھی مخدومپور

ہم صبح پیدل ہی آوارہ گردی کے لئے نکلے تھے۔سٹی سینٹر دیکھا،مس جولی کے ساتھ پرلطف باتیں ہوئیں اوراب واپسی کا ارادہ تھا۔دوپہر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ہر چند کہ دل چاہا کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر پیٹ پوجا کی جائے لیکن ہمیں برمنگھم میں پہلے روز سے ہی کھانا گھر کھانے کی تاکید کی گئی تھی۔اِس لیے فی الحال کسی ریستوران میں بیٹھ کر ضیافت اڑانے کا خیال دل سے نکالا اور گھر کے راستے پر ہو لیے۔

'' کچی نالیوں والی گلیاں،اینٹوں کی دیواریں،حمید کا کھوکھا،مشتاق حجام،رزاق کا سوہن حلوہ،اسحاق ریڈیو والا،میٹرک پاس دانتوں کا ڈاکٹر عرف موٹا چاچا،عبدالقادر دواخانہ،راہی میڈیکل ہال،سال بھر جاری رہنے والے میلے ٹھیلے،کوسوں دور پھیلے ہوئے گندم کے سنہرے خوشے،آسمان پر منڈلاتا ایک آوارہ بادل،اور مشتاق حجام کی قینچی تلے بیٹھا بکرا وقار،یہ ہمارا چھوٹا سا گاؤں ''مخدوم پور'' تھا۔اسٹیشن تک جانے کے لئے درختوں کے ایسے ذخیرے سے گزرنا پڑتا تھا کہ افریقہ کے گھنے جنگلوں کا گمان ہوتا تھا۔دوکان پر بیٹھا موٹا چاچا،روٹیاں لگانے والی ماسی ''بکھوں'' جس نے گالیوں میں پی۔ایچ۔ڈی کر رکھی تھی،قدم قدم پر دعائیں دیتے بابے اور چاچے،بلائیں لیتی ماسیاں،چٹکلے بناتے دوست،خلوص کی بارشیں،گلیوں کی محبت،اور انہیں ٹوٹی پھوٹی گلیوں میں سینچا گیا ہمارا یہ بدن،اِن صاف ستھرے سفید فٹ پاتھوں پر اٹھتے قدم،بلند و بالا عمارتیں،دھواں اڑاتی لمبی گاڑیاں،بوس و کنار کرتے لوگ،شرارتیں کرتا چلبلا موسم،.....ہم کہاں ہیں..... یہ دو مختلف مناظر ایک ساتھ .....کیسے ممکن ہو گیا۔اچانک ہوش آیا تو پتہ چلا بندہ ایک تھا مقامات دو..... ماحول نیا تھا روح اپنے دیس میں تھی.....خیالات کا دھارا ہمارے گاؤں کی طرف مڑ گیا تھا۔ہم غیر ارادی طور پر اپنے دیس میں پہنچ گئے تھے۔گھر نزدیک تھا۔ہم نے ایک دکان سے چیونگم خریدی اور چپ چپ کرتے گھر پہنچ گئے۔آج کا دن سٹی سینٹر اور اپنے گاؤں کی یادوں کی نذر ہو گیا تھا۔''

برمنگھم میں مزید آوارگی

برمنگھم چھوٹا شہر نہ تھا اور نہ ہی یہاں گھومنے کے لئے صرف ایک جگہ سٹی سینٹر ہی تھی۔ جی بہلانے اور انجوائے کرنے کے لئے بیسیوں ایسے مقامات تھے جہاں ہم گئے اور ہم نے خوب سیر کی.....ایک شام ہم برمنگھم ہلز پر چلے گئے جہاں لوگ دنیا کی مصروفیات سے جان چھڑا کر سکون کی خاطر سرِ شام آنا شروع کر دیتے تھے..... بچے یہاں کھیلتے دکھائی دیتے اور اپنی اپنی دوربینوں سے آسمان پر مختلف ستارے تلاش کرتے نظر آتے تھے۔ اونچی پہاڑیوں کے ذریعے برمنگھم شہر مکمل طور پر دیکھا جا سکتا تھا.....دور تک ڈھلتی شام کے سائے شہر کو الوداع کہتے نظر آتے اور شہر کی روشنیاں شام کے اندھیرے کو خوش آمدید کہتی دکھائی دیتیں۔ کسی تنگ آئے اور قید شدہ جانور کی مانند آزادی ملتے ہی ان پہاڑیوں پر اگی ہوئی خوبصورت اور سرسبز و شاداب گھاس پر لوٹ پوٹ ہوا جا سکتا تھا.....

برمنگھم شہر کے درمیان میں ایک خوبصورت نہر (کینال) بھی بہتی تھی۔ سٹی سنٹر میں اس نہر کے کنارے با قاعدہ ہوٹل اور چائے خانے بنے ہوئے تھے۔ نہر میں خوبصورت کشتیاں ہمہ وقت ڈولتی تیرتی رہتی تھیں۔ لوگ پانی میں کانٹا ڈالے مچھلی پکڑتے نظر آتے تھے۔ نہر کنارے خوبصورت ریستورانوں کے باہر کرسیاں بچھی پڑی ہوتی تھیں جن پر بیٹھے لوگ خوش گپیوں، قہقہوں اور گانے بجانے میں مصروف نظر آتے تھے۔ ہر شخص اپنی دنیا آپ سجائے دکھائی دیتا تھا۔ کوئی گٹار لے کر ایک طرف راگ بکھیرتا تو کوئی بانسری بجاتا نظر آتا، بوڑھے اور بوڑھیاں نہر پر بنے ترچھے پل پر کھڑے بطخوں کو دانہ اور پاپ کارن ڈالتے نظر آتے۔ ایک طرف چھوٹے بچے انہی بطخوں کے ساتھ کھیلتے اور شغل کرتے دکھائی دیتے تھے.....سٹی سنٹر میں نہر کا مقام انتہائی خوبصورت اور پر کشش تھا۔ ایک مکمل جیتی جاگتی دنیا تھی جو نہر کے دونوں طرف آباد تھی۔ بڑی بڑی اونچی عمارتوں کے سائے نہر کے گہرے پانی میں ڈولتے رہتے تھے۔ دور جا کر یہ نہر ہماری قیام گاہ یعنی محمود صاحب اور اورنگ زیب صاحب کے گھر واقع اسپرنگ ہلز کے نزدیک سے گزرتی تھی۔ اسی نہر کے کنارے ایک پرانی جیل واقع تھی۔ جس کی اونچی اونچی اور کالی پڑتی دیواروں پر کائی جمی نظر آتی تھی۔ نہر کے کنارے اینٹوں کا ایک خوبصورت فٹ پاتھ بنا تھا جس پر لوگ کانوں میں میوزک لگائے ورزش کرتے اور دوڑتے دکھائی دیتے تھے۔ بوڑھے انگریز ہیٹ پہنے چھوٹے سے موڑھے پر نہر کنارے بیٹھے مچھلی پکڑتے دکھائی دیتے تھے۔ نہر کنارے جن لوگوں کے مکانات واقع تھے، انہوں نے اپنی کشتی کھڑی کرنے کے لئے با قاعدہ پانی کی جگہ بنائی ہوئی تھی جس کی حفاظت پانی کے اوپر لکڑی کے گیٹ سے کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بچے پانی کے اندر فوم پھینک کر اس پر بیٹھے تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ نہر کنارے چھوٹے موٹے پھل اور رنگ برنگ پھول اگتے تھے۔ فالسے جیسے ایک پھل کا ذائقہ ہم نے پہلی مرتبہ یہیں چکھا۔ برمنگھم میں گزارے دس پندرہ دنوں میں ہم روزانہ کوئی نہ کوئی وقت نہر کنارے خاموشی اور سکون

میں گزارتے ،لوگوں کونہر کنارے چلتے پھرتے اور ہاتھ میں کتاب تھامے پڑھتے دیکھتے ،بچوں کواٹھکھیلیاں اورانگریز بیبیوں کو ہنستے دیکھتے.....مختصر یہ کہ نہر کا حسن بہت سی دوسری خوبصورت اورزندگی سے لبریز چیزوں کا حسن اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا.....

ایک شام ہم برمنگھم کے معروف پلازے ''سٹارسٹی'' گئے.....چار پانچ منزلوں پر مشتمل اس پلازے میں ہوٹل،ریستوران، سینموں،کیسینوز، بار،شراب خانوں،شاپنگ گیلریوں کے علاوہ بیسیوں جگہیں تھی۔رات نو بجے تک شاپنگ کی دکانیں بنداور کیسینواورشراب خانے اورسینمازآباد ہوجاتے تھے۔ہمارا ارادہ سینما دیکھنے کا تھا لیکن تمام ٹکٹیں بک چکی تھیں۔ہم نے کچھ وقت ایک کیسینو میں بال پھینک کراور دیگر گیمز کھیل اور دیکھ کرگزارا۔پانچ چھ سینموں میں سے کسی ایک پر کوئی ہندی فلم بھی لگی تھی۔ وہاں کوئی مسلم ریستوران نظرنہ آتا تھالہذا پیٹ پوجا گھر واپسی تک موقوف کردی.....

ایک دن ہم پاشا بھائی کی رہنمائی میں برمنگھم کے مغرب میں واقع کھلے میدانوں میں گئے جہاں کھلی اوروسیع فضا میں لوگ کھُل کھیلنے آتے تھے۔یہاں چھوٹے جہاز کی سواری،گلائیڈنگ اور پتنگ بازی سمیت دیگر کئی کھیلوں کی سہولت میسر تھی۔ہماری قیام گاہ کے نزدیک ایک بڑی جھیل اور بڑا پارک تھا۔جھیل میں کشتی رانی،مچھلی پکڑنے کی سہولت بھی موجود تھی۔یہیں ہم نے ایک بوڑھے بڑھیا کواپنے کتے کتیا کوایک دوسرے سے متعارف کرواتے ہوئے دیکھا۔اس جھیل کے ارگرداونچے اور ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے جن میں خوبصورت رستے بنے ہوئے تھے۔بچے اور جوان ان راستوں پر سائیکلیں دوڑاتے اورخود دوڑتے دکھائی دیتے تھے۔لوگ گھاس پر کپڑا بچھائے،کھانے پینے اورکھیلنے کا سامان اپنے اردگرد پھیلائے پکنک مناتے دکھائی دیتے تھے۔نوجوان جوڑے ایک دوسرے سے ناراضگی دورکرتے اورہم دور سے کھڑے دیکھتے بھلے لگتے تھے۔

ہم سنٹرل لائبریری کے علاوہ اپنی قیام گاہ کے نزدیک واقع ٹاؤن لائبریری میں بلاناغہ حاضری دیتے تھے۔ایک تو وہاں کی میم بہت اچھی تھی، دوسرے وہاں اردو کی بہت سی کتب بھی دستیاب تھیں۔علاوہ ازیں ہم محمود صاحب کے ساتھ کبھی کبھی ان کے کاروباری علاقے ڈیڈلی چلے جاتے تھے۔ڈیڈلی کے لئے اگر اکیلے جانا ہوتا تو ہم ایک پاؤنڈ کی ٹکٹ خریدتے اورڈبل ڈیکر بس کی چھت پر بیٹھ کرسفر کرتے اور درختوں کے پتوں سے کھیلتے جاتے.....برمنگھم ایک پرامن،اور بے حد پرسکون شہر تھا۔یہاں کی ہرجگہ کے ساتھ ہماری خوبصورت یادیں وابستہ ہوچکی تھیں جوکہ کبھی نہ بھولنے والی یادیں تھیں۔

.....

ولیم تیرے دیس کے رنگ نرالے

تم ولیم ورڈزورتھ کو جانتے ہو؟.....

بالکل، اُسے کون نہیں جانتا.....

کل ہم اُس شہر جائیں گے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ جس جگہ کے قدرتی حسن نے اس کے اندر کا فطری شاعر بیدار کیا اور جس سر زمین کے حسنِ لازوال سے متاثر ہو کر اُس نے شہرہ آفاق نظمیں لکھیں۔

پکنک کا سارا ساز و سامان تیار کر لیا گیا تھا۔ ہم علی الصبح روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ چلنے سے پہلے ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ ہم میں سے کسی نے آج کے موسم کا حال دریافت نہ کیا تھا۔ یورپ میں یہ رواج عام ہے بلکہ احتیاط پسندی اور سفر شروع کرنے کے لوازمات میں سے ایک ہے کہ اگر آپ کو کسی جگہ گھومنے جانا ہے تو آپ وہاں کے اگلے کئی دنوں تک کے موسم کا حال معلوم کر تے ہیں۔ موسم ابر آلود تھا۔ محمود صاحب گھر کے سامنے سڑک پر گاڑی اسٹارٹ کئے انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا اور ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ شہر سے نکلے تو دھند کے باعث گاڑی چلانا دشوار ہو رہا تھا۔ لیکن اوکھلی میں سر دیا تو اولوں سے کیا ڈرنا کے مصداق ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سفر جاری رکھا۔ ہماری منزل ''لیک ڈسٹرکٹ'' تھی۔ ''لیک ڈسٹرکٹ'' کیا ہے بہت سی چھوٹی بڑی جھیلوں کا مجموعہ ہے۔ برمنگھم سے ''لیک ڈسٹرکٹ'' کا فاصلہ کلومیٹر میں تبدل کر کے قریب از قیاس 85 کلومیٹر بنتا تھا۔ برطانیہ میں فاصلہ میلوں میں لکھا جاتا ہے۔ بشمول محمود صاحب کے ہم ''لیک ڈسٹرکٹ'' پہلی مرتبہ جا رہے تھے۔ لیک ڈسٹرکٹ کو پاکستان کے شمالی علاقہ جات سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ ہری بھری وادیوں، سبزہ زاروں، ان گنت چھوٹی بڑی شفاف جھیلوں، ہرے بھرے کھیتوں، جگہ جگہ بنے خوبصورت قدیم گاؤں اور مکانوں، رنگ برنگ پرندوں اور ان کے ترانوں اور قدرت کے دلچسپ و دلفریب نظاروں کے باعث یہ علاقہ گرمیوں میں تمام سیاحوں کے لئے جنت بن جاتا ہے۔ محمود صاحب بتانے لگے کہ سکاٹ لینڈ جاتے ہوئے اُن کا متعدد بار اِس شہر کے باہر سے گذر ہوا لیکن کبھی تفصیلی طور پر دیکھنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ لہٰذا آج ہمارے بہانے وہ بھی اس صحت افزاء مقام کی سیر کر لیں گے کہ پیٹ پالتے پالتے اور شہر کی گہما گہمی و شور شرابے سے دل اکتا سا گیا ہے.....

ہم نقشہ گود میں پھیلائے ہوئے لیک ڈسٹرکٹ کی طرف مڑنے والی سڑک کا تعین کر رہے تھے۔ گاڑی M6 نامی موٹروے پر فراٹے بھر رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا اس لئے سڑک پر ٹرکوں کی بہتات تھی جو ایک لین میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ کبھی کبھی اونٹوں کے کارروان، مال گاڑی کے ڈبے، چیونٹیوں کی قطاریں اور دھیمی دھیمی رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں

دواں ٹرکوں کے قافلے دیکھ کر کتنا سکون محسوس ہوتا ہے اور ان نظاروں کو دیر تک دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی ایک عجیب رویے سے سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ٹرکوں کے ان کارروانوں کو دیکھ کر ذہن ماضی کے قافلوں کی طرف چلا گیا.....

''دل چاہا کسی طرح اس زمانے میں پہنچ جائیں جب لق ودق صحراؤں میں اونٹوں کے قافلے سینکڑوں میل کے سفر پر نکلا کرتے تھے اور ساربان پہلے اونٹ کے ساتھ باقی اونٹوں کی رسی باندھ دیا کرے تھے اور باقی اونٹ پہلے والے کے پیچھے سر جھکائے چلتے رہتے تھے اور ان کے گلے میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ایک سریلے پن کو جنم دیا کرتی تھیں۔ سارے مسافر اور ساربان مل کر رات کی پرسکون تنہائی میں اپنے اپنے گیتوں کی تانیں بلند کیا کرتے تھے۔ پھر دور کہیں کوئی بھولا بھٹکا مسافر ان راگوں کی آواز سن کر ہمت مجتمع کرتا تھا اور دشت میں آبلہ پا وہ مسافر کسی انسان کی موجودگی کو ترستا ہوا اس نئے قافلے میں شامل ہو کر خوشیوں بھرا سانس لیا کرتا تھا۔ یہ زندگی کے وہ قدرتی، خالص اور حقیقی کردار ہوتے تھے جو آج کی ماڈرن دنیا میں ناپید ہیں۔''.....

ہم دورِ ماضی کے اِن سنہری خیالوں میں گم تھے کہ محمود صاحب کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ہمارے متوجہ ہونے پر پریشان ہو کر کہنے لگے، لگتا ہے گاڑی میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ کہیں رک کر دیکھ لینا چاہئے .....اپنی منزل اور گھر دونوں سے دور ہیں اور موسم کے تیور بھی کچھ اچھے نہیں لگتے، کوئی مشکل ہی نہ آن پڑے۔ انہوں نے گاڑی قریبی سروس اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر موڑ دی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈا موسم تھا۔ حالِ دل پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ سیر کی خوشی چھائی ہوئی تھی اور اِس قدر خوبصورت سماں میں دل کو بے حد سرور ملا.....دل چاہا کہ انسان ہوا کے دوش پر رقص کرتا جائے۔ محمود صاحب نے مکینیکل کمپنی کو فون کیا۔ مکینک بیس منٹ کے اندر اپنا ٹرک لے کر پہنچ گیا اور محمود صاحب کے ساتھ گاڑی چیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ہم کھلے آسمان تلے بوندا باندی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پارکنگ لاٹ میں مختلف رنگوں کی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سامنے سپر اسٹور میں روشنیاں جلی ہوئیں تھیں اور لوگ ہنس کھیل کر سامان خرید رہے تھے۔ یہ گیلا گیلا موسم ہمارے سفر کا سب سے خوبصورت حصہ تھا۔ سفر میں حضر کا بھی اپنا ایک مزا ہوتا ہے۔ جب تک سفر میں مشکلات درپیش نہ ہوں انسان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنے گھر سے، اپنے دیس سے کہیں دور انجان راہوں کی مٹی میں خاک آلودہ ہو رہا ہے۔ ہم موسم کے سحر میں گرفتار تھے کہ محمود صاحب نے گاڑی ٹھیک ہونے کی نوید سنائی اور ہمیں چار و ناچار موسم کی دل باز حسینہ کو تنہا چھوڑ کر واپس گاڑی میں آنا پڑا۔ بقول محمود صاحب گاڑی میں کوئی خاص خرابی نہ تھی۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ گاڑی کی انشورنش کروانے سے آپ کو پورے یورپ میں کسی بھی مقام پر مکینک دستیاب ہو جاتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں آپ کو دوسری گاڑی مہیا کی جاتی ہے۔

ہم نے اُن کی بات ختم ہوتے ہی پوچھا.....اور جان جانے کی صورت میں؟

جان جانے کی صورت میں کمپنی کی طرف سے کیا ملتا ہے.....وہ ہنس پڑے.....پھر شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے سرد آہ بھر کر بولے.....ہمارے پیچھے رہ جانے والوں کو ایک نئے سفر کا خرچہ.....

ہم کسمسا کر رہ گئے.....

ہم ابھی تک بڑی احتیاط سے سفر کر رہے تھے کہ کہیں کوئی موڑ چھوٹ نہ جائے یا آگے ہی نہ نکل آئیں لیکن جس بات کا خدشہ تھا وہی ہوا۔یعنی کہ ہم ایک موڑ مڑنا بھول گئے اور ہمیں تقریباً دس کلومیٹر کا سفر مزید طے کرنے کے بعد یوٹرن لے کر واپس آنا پڑا۔اور پھر ہم ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ونڈمیئر، رائیڈل اور ڈرونٹ واٹر لیک ڈسٹرکٹ کی مشہور جھیلیں ہیں اور یہیں سیاحوں کی کثیر تعداد سیر کے لئے آتی ہے۔ان کے علاوہ بھی کئی جھیلیں پورے علاقے میں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ہمیں ونڈمیئر جھیل کا رستہ معلوم نہ تھا۔رہنمائی کی خاطر چند راہگیروں سے مدد حاصل کی اور بھٹکتے بھٹکتے آخر کار اپنی منزل پر پہنچ گئے۔جھیل سے دور گاڑی ایک خوبصورت سڑک پر کھڑی کی۔سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی یہ سڑک اوپر کہیں کسی پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ختم ہوتی تھی جہاں اس وقت ایک لینڈ کروزر اور اس کے اردگرد ایک جوڑا دنیا سے بے نیاز موسم کے سحر میں جکڑا ہوا اٹھکھیلیاں کرتا نظر آ رہا تھا۔اور ہم اِس سڑک کے آغاز میں کھڑے قدرت کے تماشے دیکھ رہے تھے۔پھر چاروں طرف موجود بلند و بالا سرسبز پہاڑوں اور قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جھیل کی جانب چل پڑے۔اردگرد پیرا شوٹ سے ڈھکی ہوئی کشتیاں نظر آ رہی تھیں جو کہ جھیل سے نکال کر سبزے پر کھڑی کی گئیں تھیں۔جھیل کے درمیان میں ایک جزیرہ نما تھا جس پر تفریح کے لئے کئی لوازمات موجود تھے۔جزیرہ نما تک جانے کے لئے ایک بڑی کشتی کی ٹکٹ خریدنی پڑتی تھی۔ٹکٹ آفس سے ٹکٹیں خرید کر ہم کشتی کا انتظار کرنے لگے۔جزیرہ نما دور سے بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا، کافی دیر سے ہو رہی بوندا باندی تھم چکی تھی لیکن موسم تا حال خنک تھا۔کشتی کے ذریعے ہم اِس چھوٹے سے تفریحی مقام پر پہنچ گئے۔یہاں ریسٹورنٹ اور مارکیٹس بنی ہوئی تھیں۔دکانوں سے پیچھے تا حدِ نگاہ سرسبز جنگل پھیلا ہوا تھا۔سبز رنگ قدرت کا محبوب رنگ ہے۔اور آنکھوں کو بے حد تر و تازگی بخشتا ہے۔اِس کی ایک بے حد عمدہ مثال یہ ہے کہ خزاں میں جب تمام تر درخت بیل بوٹے زرد لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور اُن کا سبز رنگ زرد لباس کی تہہ میں ڈھانپ دیا جاتا ہے تو ایک اداس ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔لاکھ موڈ خوشگوار ہو لیکن جب تک قدرت کے نظارے زرد روپ دھارے رہتے ہیں آنکھوں کو حسن کا وہ نظارہ دستیاب نہیں ہوتا جو بہار کے جوبن پر دیکھنے کو ملتا ہے لیکن زرد مائل پتوں میں بھی ایک حسن پنہاں ہے جو ایک عاشق مزاج انسان بہتر طریقے سے محسوس کر سکتا ہے۔اِس خوبصورت جنگل کو دیکھنے کے لئے چھانگا مانگا کی طرح ٹرین کا بہترین انتظام موجود تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث ہم اِس سہولت سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ایک کافی بار سے ہم نے کافی خریدی جسے چسکیاں لے لے کر پینے کے بعد موسم کی ٹھنڈک کا اثر کسی حد تک زائل ہو گیا۔یہیں سے پتہ چلا کہ جس گھر میں ولیم ورڈز ورتھ کی پیدائش ہوئی تھی اس گھر کو چھوٹے سے میوزیم کا درجہ دے دیا گیا ہے جبکہ اس گاؤں کے تمام گھروں کو ایک خوبصورت رنگ میں رنگ دیا گیا ہے جو کہ ایک ماڈل گاؤں کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تا کہ عظیم شاعر کے دور کی یاد کو اپنے قدرتی رنگ میں برقرار رکھا جا سکے۔ایک جھیل کے کنارے وہ جگہ بھی محفوظ کر

دی گئی ہے جہاں اس نے بیٹھ کر اپنی مشہور نظم غالباً ''ڈیفوڈلز'' لکھی تھی۔ بہرِ طور چاروں طرف کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے حضرتِ انسان کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ ''قدرتی خوبصورتی'' دنیاوی آسائشوں اور انسانی ہاتھ سے پیدا کی گئی خوبصورتیوں سے سے کہیں زیادہ اثر رکھتی ہے۔ ہر طرف رنگ برنگ پھول کھلے تھے۔ جھیل کے شفاف پانی میں جھیل کی تہہ صاف نظر آتی تھی۔ تہہ میں خوبصورت رنگ کے پتھر پڑے نگینے لگ رہے تھے۔ تیرتی ہوئی مچھلیاں جھیل کے پانی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مچھلی کے شکار کی اجازت نہ تھی۔ مچھلی کے شکار کے لئے علیحدہ مقام بنایا گیا تھا اور مچھلی کے شکار کا سامان بھی کرایے پر دستاب تھا۔ اِن حسین نظاروں کو دیکھ کر ہمیں اپنے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سحر انگیز وادیاں یاد آ گئیں۔ سیف الملوک جھیل کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے جس کی سیر ایک سبق آموز واقعے کی وجہ سے ہمارے لئے تا عمر ایک یادگار رہے۔ واقعہ کچھ اس طرح سے رونما ہوا کہ.....

بچپن میں ہم اپنے گھر والوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر پر گئے تھے۔ شاید پانچ یا چھ سال کی عمر ہوگی۔ جھیل سیف الملوک پہنچے تو ہماری جیپ جو کرایہ پر حاصل کی گئی تھی، راستے میں پھنس گئی اور ہمیں پیدل اتر کر جھیل تک جانا پڑا۔ ہم تو شاید کسی بڑے کی گود میں رہے ہونگے، جھیل پر پہنچ کر پل کراس کیا اور ایک جگہ سبزے میں جا کر سب لوگوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اتفاق سے اس دن ہمارے جیب میں کوئی دو چار روپے موجود تھے۔ اس دور میں مینگو جوس شاید تین یا چار روپے کا ملا کرتا تھا۔ سب بڑوں سے آنکھ بچا کر ہم مینگو جوس لینے کے لئے اکیلے ہی جھیل کے پل کی طرف نکل پڑے جہاں کئی پٹھان کھانے پینے اور دیگر چیزیں بیچنے میں مصروف تھے۔ شاید اصل وجہ یہ بھی نہ رہی ہو کیوں کہ جب ہم موقعِ واردات پر پکڑے گئے تو نجانے کتنی ہو چکی تھی اور ہمیں اپنے ہونے نہ ہونے کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ شاید پل پر کھڑے ہو کر جھیل کے پانی کا نظارہ کر رہے تھے کہ کسی نہ پیچھے سے آ کر یکدم اٹھا لیا، گردن گھمائی تو والدِ محترم تھے، ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ انہوں نے وہیں پدرانہ شفقت سے لیس ہو کر دو تین تھپڑ رسید کئے اور پھر اپنوں میں آ کر باقاعدہ پوچھ گچھ اور تفتیش شروع کر دی کہ ننھی سی جان بغیر بتائے اور پوچھے کہاں چلے گئے تھے.....اتنے گہرے پانی سے خوف بھی نہ آیا، ان کا موڈ تو شاید اسی انداز میں پکنک منانے کا تھا کہ پیچھے سے کوئی اور شخص آیا اور اس نے ہمیں گود میں اٹھایا اور والدِ محترم سے گذارش کی کہ ابھی بچہ ہے، وغیرہ وغیرہ اور یوں اس تاریخی پٹائی کا اختتام ہوا جو ہماری دیگر یادگار پٹایوں میں سے ایک تھی۔ بلا شبہ ہمارے والد کی محبت تھی کہ ان کے عظیم سیاح سپوت کے کھو جانے کا ڈر تھا۔ لیکن وہ پٹائی نہ آج تک بھولی اور شاید نہ کبھی بھول سکے گی کہ آج بھی ہمیں من مرضی کرنے کا شوق ہے کہ بس راستے سامنے ہوں، اور ہم آنکھ بچا کر نکل جائیں اور آزاد پرندوں کی طرح جہاں چاہیں گھومیں۔ ان پٹائیوں کو یاد کر کے اب احساس ہوتا ہے کہ انسان کو پوری زندگی میں اچھا برا سمجھانے والا ماں باپ سے زیادہ اور کوئی مخلص نہیں ہوتا۔

اس جھیل کے اردگرد مناظر کی خوبصورتی دیکھ کر اور چاروں طرف پہاڑوں اور خوبصورت نظاروں کو دیکھ کر کہنا پڑا کہ ولیم تیرے

دیس کے روپ نرالے ہیں۔پس ثابت ہوا کہ انسان جس مٹی میں پیدا ہوتا ہے اور جس سرزمین کی گود میں جوان ہوتا ہے۔اُس کی باتوں، اُس کی تحریروں اور اُس کے طور اطوار میں اپنے دیس کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔بلاشبہ کسی خوبصورت خطے میں کوئی انسان جنم لے اور وہ اپنی عمر کے کسی حصے میں کچھ لکھے تو اُس کے دماغ میں سب سے پہلا منظر اُس کے دیس، اُس کے گاؤں اور اُس کے وطن کا آئے گا۔

''لیک ڈسٹرکٹ'' میں متعدد چھوٹے چھوٹے گاؤں ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہیں۔ان قصبوں کے قدیم طرز کے مکانوں کو اپنی اصلی حالت میں رکھا گیا ہے۔یہاں کے لوگ بے حد مہمان نواز ہوتے ہیں۔اس علاقے کو اپنے سپوت ''ولیم ورڈز ورتھ'' پر فخر ہے جس نے یہاں کی پہاڑیوں اور جھیلوں پر بیٹھ کر خوبصورت وادیوں اور آبشاروں کی پر خوبصورت نظمیں تخلیق کیں اور اس علاقے پر سیاحوں کے راستے کھل گئے۔لیک ڈسٹرکٹ کی قدرتی مقبولیت اپنی جگہ لیکن اس علاقے کو دنیا میں ایک جانا پہچانا نام دینے میں ''ولیم'' کا کردار ہرگز نہیں بھلایا جا سکتا۔بے شک لکھنے والا جب لکھنے بیٹھتا ہے تو پہلی چیز وہ لکھتا ہے جو اپنے اردگرد دیکھتا ہے، یا سنتا اور پڑھتا ہے۔یہ ''لیک ڈسٹرکٹ'' کی خوش نصیبی ہے کہ ''Poet of nature'' ''ولیم ورڈز ورتھ یہاں پیدا ہوا اور اس نے جو بہترین نظمیں لکھیں وہ یہیں، اسی سرزمین کی گود میں بیٹھ کر لکھیں۔ولیم واقعی تیرے دیس کے رنگ نرالے ہیں۔

.....

ایک سال پہلے کا ولیمہ

انجوائے کرتے ہوئے لوگوں میں کچھ وقت گزار کر ہم نے واپسی کی راہ اختیار کی۔ واپسی پر ایک راہگیر سے کسی اور جھیل کا راستہ معلوم کرنا چاہا تو اس نے بتایا کہ یہاں ایک 'کینڈل' نامی قصبہ ہے اور وہاں ایک خوبصورت جھیل موجود ہے۔ اُس کے بتائے ہوئے رستے پر ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ اچھا خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی ہمیں کوئی جھیل نظر نہ آئی تو محمود صاحب نے گاڑی سڑک کنارے بنے ہوئے ایک ہوٹل کے پاس روک لی اور مزید پوچھنے کے لئے اندر چلے گئے۔ ہمارے پاس اردگرد کا نظارہ کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہم جن پہاڑوں کے سائے میں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، وہ پہاڑ اب یہاں سے بہت دور حسن کا ایک معمہ معلوم ہو رہے تھے۔ اونچی نیچی زمین پر دور تک فصلیں پھیلی ہوئی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ دور تک زمین پر قرینے سے سبز اور سنہری قالین بچھے ہوئے ہوں۔ قدرت کی صناعی پر ابھی انگشتِ بدنداں ہونے میں مصروف تھے کہ محمود صاحب بڑبڑاتے ہوئے واپس آتے نظر آئے.....اور قریب آ کر بتانے لگے کہ کمبخت نے غلط راستہ بتا دیا۔ ایک جواں سالہ لڑکا اپنے کتے کے ساتھ قریب سے گزر رہا تھا۔ ہم نے روک کر اُس سے پوچھا کہ اِس سڑک سے ہم موٹروے تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اُس نے بڑے اطمینان کے ساتھ کتے کی رسی چھوڑی، گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا اور محمود صاحب کو راستہ سمجھانے لگا۔ گھنٹہ بھر مزید بھٹکنے کے بعد ہم ''کینڈل'' سے باہر نکلے اور گاڑی موٹروے پر چڑھ گئی۔ شام کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ہمیں مانچسٹر سے ہوتے ہوئے گھر واپس پہنچنا تھا۔ موٹروے سے مانچسٹر کو جانے والے لنک روڈ پر مڑ گئے۔ مغرب کے وقت ''مانچسٹر'' شہر میں داخل ہوئے۔ دوپہر کے وقت جو بوندا باندی تھم گئی تھی اب اُس نے موسلا دھار بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ ہم نے اپنے میزبان برادرم شاہد بابر کو فون کیا اور انہوں نے ہمیں نزدیکی ہوٹل کا پتہ دیا کہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچ جائیں وہ بھی ادھر ہی پہنچ رہے ہیں۔ انتھک کوششوں کے بعد دیئے گئے ایڈریس پر پہنچے تو شاہد بھائی ہمارے انتظار میں بھیگے ہوئے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ہماری راہ تک رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں خوشی کی ایک بھرپور لہر ابھری اور وہ ہم سے بغل گیر ہو گئے۔

بہت انتظار کروایا.....وہ شکوہ کرنے لگے.....

ہمارا کیا دوش.....

ہم نے موسم کی زیادتی کا دکھڑا سنایا اور بولے.....ہم لیک ڈسٹرکٹ سے ہو کر آ رہے ہیں۔

بہت خوب.....اُنہوں نے سر ہلا کر ہمارے جواز کو جائز قرار دیا اور پھر بولے کہ چلو گھر چلتے ہیں۔ میری گاڑی کے پیچھے پیچھے آ جاؤ.....

شاہد بھائی ہمارے والد کے چچا زاد ہیں لیکن ہم ہمیشہ سے انہیں بھائی کہتے آئے ہیں۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے.....ہم پیار سے ان کو پپو بھائی کہا کرتے ہیں۔اُس وقت شاہد بھائی مانچسٹر میں ادارہ منہاج القرآن کے منتظمِ اعلیٰ تھے ۔پاکستان میں ان کی شادی ہوئی تو شادی کے فوراً بعد برطانیہ چلے آئے اور پچھلے ڈیڑھ سال سے ہماری اُن سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ مختلف سفری مجبوریوں کی بنا پر ہم پاکستان میں اُن کی شادی کی تقریب میں شرکت نہ کر سکے تھے۔اِس لئے دیر آمد درست آمد کے نظریے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے چھوٹتے ہی اُن کو مبارباد دی۔وہ ہنس کر ٹال گئے کیونکہ ایک سال کے لمبے عرصے کے بعد بھی شادی کے ذکر پر اُن کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ہم اُن کی رہنمائی میں اُن کے گھر پہنچے۔بھابھی سے ملے جنہوں نے گود میں ایک انتہائی خوبصورت اور معصوم بچی اٹھائی ہوئی تھی۔بچی کو دیکھتے ہی دل سے ہزاروں دعائیں نکلیں۔شاہد بھائی اور بھابھی کو بیٹی کی مبارکباد دی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔جتنی دیر میں ہم ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوئے اتنے میں بھابھی نے دسترخوان سجا دیا اور لو گو!! کیا کچھ نہ تھا کہ تکلفات کی انتہا ہو گئی تھی۔

شاہد بھائی! ہم تو اپنے ہی لوگ تھے۔کوئی غیر تو نہ تھے کہ آپ نے عام سے ڈنر کو پر تکلف اور پر لطف دعوت کا روپ دے دیا۔ہم نے کمزور سا شکوہ کیا.....

انہوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بولے.....یار تم ہمارے ولیمے میں آئے نہیں تو اِسے ولیمہ ہی سمجھو.....ان کی بات ختم ہوتے ہی بھابھی جی کی مسکراہٹ ہم سے چھپی نہ رہ سکی۔

باتوں باتوں میں ذکر نکل آیا کہ ہم دو روز تک لندن جا رہے ہیں اور وہاں سے فرانس جانے کا ارادہ ہے۔فرانس کا ذکر آتے ہی شاہد بھائی نے ایک سودمند بات بتائی کہ اگر ہم پیرس کے ہوٹلوں میں دھکے کھانے اور سستی رہائش گاہوں کی تلاش سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ ہمارے لئے رہائش کا مناسب بندوبست کروا سکتے ہیں۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں.....ہم نے لقمہ چباتے ہوئے جواب دیا.....

وہ بولے.....پیرس میں ادارہ منہاج القرآن کے منتظمِ اعلیٰ جناب طارق اعظم سے میری خاصی جان پہچان ہے۔میں اُن کا ایڈریس اور ایک تعارفی خط آپ کو دے دیتا ہوں۔وہ آپ کو دوستوں کی طرح ملیں گے اور بھائیوں کی طرح آپ کے لئے سہولت کا سب سامان مہیا کر دیں گے۔

ہم نے تہہِ دل سے انکا شکریہ ادا کیا اور آہ بھر کر بولے ویسے بھی پیرس جیسے مہنگے اور مصروف شہر میں سستی جگہ ڈھونڈنا ہم جیسے سیاحوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

شاہد بھائی نے سابقہ ریکارڈ کو برقرار رکھتے ہوئے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

کھانے کے بعد گپ شپ کی ایک طویل نشست ہوئی۔اور رات بارہ بجے کے قریب ہم نے واپسی کے لئے آواز بلند کرنا شروع

کر دی جو شاہد بھائی کے حکم کے سامنے دب کر رہ گئی لیکن ہماری ضد، ہٹ دھرمی اور لندن کے سفر کے لئے انتظامات کرنے کا جواز کام آیا اور ہم نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ شاہد بھائی نے پاکستان کے لئے کچھ چیزیں اور تحریری پیغامات دیئے اور پیرس میں طارق اعظم صاحب کا ایڈریس دیتے ہوئے گلے ملنے کے لئے بازو پھیلا لئے۔ بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی.....دل تھا کہ بیٹھ کر خوب باتیں کرتے.....لیکن تمہاری جلد بازی کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہوں.....اُن کا لہجہ نم ہو گیا.....

چند گھنٹوں کی ہی سہی، ملاقات تو تھی.....ہم نے الوداعی کلمات کا اختتام کیا اور بولے سب سے زیادہ خوشی اور مسرت ایک سال پہلے کا ولیمہ ایک سال بعد کھا کر ہوئی ہے اور یہ یادگار ولیمہ برسوں یاد رہے گا.....دعا ہے کہ ہمیشہ خوش رہو، شاد رہو، آباد رہو.....خدا حافظ.....ہم گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے اور محمود صاحب نے شاہد بھائی سے مختصر ملاقات کے اہم نکات پر اظہارِ خیال کرنا شروع کر دیا۔ موٹر وے پر دوڑتی ہوئی ٹمٹماتی بتیوں والی گاڑیوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے رات کے آخری حصے میں ہم گھر پہنچے اور اب کی بار ہماری منزل نرم و ملائم بستر تھا.....

.....

پلے بال

اب سے ہمارے سفر میں ایک نیا موڑ آنے والا تھا۔ مسلسل سفر میں رہتے ہوئے رات گزارنے کے لئے کسی جگہ کا انتظام کرنا تھا اور دن میں لندن دیکھنا تھا۔ ہم نیشنل ایکسپریس کی ایک خوبصورت بس کے ذریعے لندن کے راستے پر رواں دواں تھے۔ بس میں تیس کے قریب مسافر سوار تھے۔ بس صبح سات بجے کے قریب برمنگھم بس اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور اب موٹروے پر دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیور باقاعدہ سفید وردی میں ملبوس تھا۔ ایک لمحے کے لئے ذہن مادرِ وطن کی سڑکوں پر چلنے والی بسوں، ویگنوں کے مثالی ڈرائیوروں کے حلیئے کی طرف چلا گیا۔ جس کا حال کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ'' گلے میں مفلر، منہ میں پان، ہاتھ میں سگریٹ، بس میں نور جہاں، نصیبو، یا عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے گیت چلائے ہوئے، آنکھیں نیند کی کمی کے باعث سرخ، اور گیتوں پر سر دھننے میں مصروف، دل کرے تو آتی جاتی گاڑی دیکھ کر پان کی پچکاری ماردی ورنہ چیونگم کی جگہ پان زندہ باد، آج نہیں تو آج سے محض چند برس قبل اپنے بیشتر ڈرائیوروں کا بہرحال یہی خلاصہ تھا''.....

صبح کا وقت تھا۔ کھڑکی کے شیشے پر جمے ہوئے بخارات سے ظاہر ہوتا تھا کہ باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ بس جیسے جیسے لندن کے قریب پہنچ رہی تھی ویسے ہی دل کی دھڑکنیں اپنی رفتار میں ردوبدل کرتی جا رہی تھیں۔ آخرکار ساڑھے نو بجے کے قریب بس غراتی ہوئی وکٹوریہ بس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہم اپنا سفری بیگ لئے آہستہ آہستہ مسافروں کے پیچھے چلتے ہوئے بس سے نیچے اتر گئے۔ ایک لمبی سی انگڑائی لی، خوشگوار فضا میں ایک خوشیوں بھرا سانس لیا اور لندن کو سانسوں کے رستے بدن میں اتار لیا۔ آج ہمارے ساتھ نہ محمود صاحب تھے اور نہ ہی زیب صاحب۔ آج ہمیں اپنی منزلیں خود ہی طے کرنا تھیں اور اپنے ہی قدموں پر چل کر وہاں تک پہنچنا تھا۔ بس اسٹیشن میں اندرون برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک کو جانے والی بسیں موجود تھیں۔ جس طرح ہمارے خیالوں پر سیر کی مستی چھائی تھی اسی طرح سیر پر جانے اور لندن پہنچنے والے ہر شخص کے چہرے پر جوش و جذبہ مسکراہٹ کی صورت میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ جیسے کرکٹ میچ کے آغاز میں ایک ٹرائی بال ہوتی ہے اسی طرح برمنگم کی سیر صرف ایک ٹرائی بال تھی۔ اصل تفریح اب شروع ہونے والی تھی۔ ہم لندن میں آوارہ گردی کا آغاز کر کے پلے بال کھیلنے والے تھے۔

.....

سردار جی کا شکریہ

لندن برطانیہ کا دل، دریائے ٹیمز کی گذرگاہ، مادام تساؤ کا شہر، دنیا بھر کے سیاحوں کا محور و مرکز، اور تاریخ کے سیاہ و سفید اوراق کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ وہی شہر ہے جسے دوسری جنگِ عظیم میں ملبے کا ڈھیر بنانے کی کوئی کسر نہ چھوڑی گئی تھی۔ اب ایک ترقی یافتہ شہر، ان گنت تفریحی مقامات، اور اپنے خوش لباس و خوش مزاج شہریوں کے باعث دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ہم جہاں گئے، جہاں رہے، ہمیں محبت کرنے والے اور پرخلوص رفقاء نصیب ہوئے۔ اور اب لندن میں بھی قسمت نے قرعہ خوش نصیبی ہمارے حق میں نکالا کہ لندن میں بھی ہمیں برداشت کرنے والے میسر آ گئے۔ اس طرح وہ وقت جو سستے ہوٹلوں، مسافر خانوں اور ہاسٹلوں کی تلاش میں ضائع ہونا تھا نہ صرف بچ گیا بلکہ یہ وقت ہم نے کئی خوبصورت مقامات کی سیر کرنے میں صرف کیا۔ بصورتِ دیگر اگر ہمیں ہوٹلوں میں قیام کرنا پڑتا تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ہم کسی صورت بخیر و عافیت پاکستان واپس پہنچ پاتے تو ہمیں برسوں قحط کا سامنا کرنا پڑتا لہٰذا بھائی عزیز کے توسط سے رہائش کا مسئلہ تو حل ہو گیا.....

اب لندن تھا، ہم تھے اور لندن کے خوبصورت و قابلِ دید مقامات تھے۔ لندن یاترا کیسے کی جائے یہ معمہ انڈر گراؤنڈ ٹرین نے حل کر دیا۔ وکٹوریہ اسٹیشن بیک وقت ٹرین اور بسوں کا اسٹیشن ہے۔ یہاں سے نہ صرف اندونِ ملک بلکہ پورے یورپ کے لئے ٹرینیں اور بسیں مل جاتی ہیں۔ سیاحوں کے لئے مخصوص کئے گئے ایک کاؤنٹر سے ہم نے کچھ سیاحتی کتابچے اور لندن کے معروف مقامات کا ایک نقشہ حاصل کیا۔ اسی طرح کا ایک نقشہ ہمیں سیاحوں کے لئے بس سروس مہیا کرنے والی کمپنی کے کاؤنٹر سے دستیاب ہوا اور پھر انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کے نقشہ جات بھی حاصل کئے جو شہر بھر کے تمام تفریحی و تاریخی اور پرکشش مقامات کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ایک طرف بیٹھ کر اطمینان سے تینوں نقشوں کو زمین پر پھیلایا اور ذاتی طور پر ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ اپنے مرتب کردہ پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں انڈر گراؤنڈ ٹرین بہترین ذریعہ نظر آئی۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے ہی انڈر گراؤنڈ ٹرین کا پورے دن کا ٹکٹ خرید لیا۔

''خوب اتفاق کی بات ہے کہ ہر سفرنامے اور ہر مسافر کے سفر میں کہیں نہ کہیں ایک عدد سردار جی، دو چار عارضی محبوبائیں، ایک دو معشوقائیں، چند حسینائیں اور کچھ بیوقوفانہ و ہوشربا مقامات آ جاتے ہیں..... باقی سب کا ذکر تو اپنے وقت پر ہی سہی، فی الوقت ہمارے سفر میں ایک عدد سردار جی ضرور آن ٹپکے اور یہ حقیقی سردار جی تھے.....

یہ سردار جی پینٹ شرٹ چڑھائے اور ہلکی سی جرسی پہنے ہوئے اپنی دھن میں مگن کہیں چلے جا رہے تھے.....

ہم نے آواز دی.....سردار جی.....!!!

وہ چونک کر رک گئے۔نظریں گھما کر ادھر ادھر حیرانگی سے دیکھنے لگے.....

ہم نے پھر کہا سردار جی ادھر پیچھے.....

انہوں نے گردن گھما کر ہمیں دیکھا اور یکدم اُن کے گاڑھی داڑھی مونچھ والے چہرے پر ایک عدد مسکراہٹ نمودار ہوئی جو رفتہ رفتہ قہقہے کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ وہ پگڑی درست کرتے ہوئے سلام دعا میں مشغول ہو گئے پھر سنبھل کر انکشافانہ لہجے میں بولے او جی پاکستانوں آئے او، دسو تاڈی کی خدمت کریئے (او جی پاکستان سے آئے ہو کہو آپ کی کیا خدمت کی جائے) نجانے ان کو یہ الہام کیسے ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ہم نے براہِ راست اُن سے اپنا مدعا بیان کرنے میں عافیت جانی اور اُن سے انڈر گراؤنڈ ٹرین استعمال کرنے کا طریقہ پوچھنے لگے۔انہوں نے خلوصِ دل سے ہمیں تفصیل کے ساتھ انڈر گراؤنڈ ٹرین اور اُس کا نقشہ استعمال کرنا سکھایا۔وہ وہیں کہیں لندن کے رہنے والے تھے۔گارمنٹس کا کاروبار کرتے تھے۔انہیں سے پتہ چلا کہ بکنگھم پیلیس جو شاہی خاندان کی سرکاری رہائش گاہ ہے یہاں سے قریب واقع ہے اور صبح کے وقت وہاں سپاہیوں کے دستوں کی تبدیلی سیاحوں کے لئے دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔اُن کی بات عقل لگتی محسوس ہوئی اور ہم اُن کو خدا حافظ کہتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

نیا دن بھرپور وجاہت کے ساتھ سورج کی گود سے چھلانگ مار کر زمین کے دامن میں آ کے بس چکا تھا۔کالے گورے لوگ تیزی سے اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں تھے۔موسم کافی خوشگوار اور اجلا اجلا محسوس ہو رہا تھا۔ایک شخص سے بکنگھم پیلیس کا راستہ دریافت کیا۔اُس نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ پیدل دس منٹ کا رستہ ہے۔ہم نے سر ہلا کر اور مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔دکانیں ابھی تک بند تھیں۔بیکری اور کھانے پینے کی چند دوکانیں کھلی نظر آ رہی تھیں۔چلتے چلتے ہمیں بائیں طرف لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔دل نے کہا ہو نہ ہو یہی ہماری منزل ہے۔تمام تر ہمت مجتمع کر کے ہم لوگوں کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ہر طرف رنگ برنگ سیاح نظر آ رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے کوریائی، جاپانی اور چینی باشندوں نے اپنی گڑیاؤں جیسی نازک محبوباؤں کو کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا جو ہاتھوں میں کیمرے لئے تقریب شروع ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔کافی دقت سے راستہ بنا کر درمیان میں پہنچے اور اونٹ کی طرح گردن اٹھا کر آگے کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔دیکھا کہ دستوں کی تبدیلی کی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔لمبے لمبے کالے بالوں والی ٹوپیوں والے سپاہی اپنے صحت مند گھوڑوں کو خوبصورت قطاروں میں آگے بڑھا رہے تھے۔سپاہیوں کی یہ کالی لمبے بالوں والی ٹوپیاں ہمیشہ سیاحوں کے لئے تعجب کا عنصر رہی ہیں اور اِن کا ذکر ہم کئی جگہوں پر پڑھ چکے ہیں۔اِس پریڈ کا نام غالباً ''ہارس گارڈ پریڈ'' تھا۔شائقین کا ہجوم لگا تھا۔پریڈ میں شامل ہر گھوڑا جاندار اور ایک عدد پرکشش دم کا مالک تھا۔جس کے لمبے ریشمی بالوں پر

یقیناً خواتین کو رشک آتا ہوگا لیکن یہ صرف ہمارا غیر محتاط قیاس ہے۔ جب یہ پریڈ اختتام پذیر ہوئی تو لوگوں کا رش کم ہونے لگا۔ سیاح اپنے اپنے کیمروں سے محل کے دروازوں، گارڈن اور محل کے بیرونی احاطے میں نصب کئے گئے مجسموں کے ساتھ تصاویر اتروانے میں مشغول ہو گئے۔ یہ تقریب خاصی دلچسپ ثابت ہوئی تھی۔ ہم سردار جی کے طفیل ہی ادھر تک پہنچے اور اِس تقریب سے لطف اندوز ہو سکے تھے اس لئے دل ہی دل میں سردار جی کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ منزل کا انتخاب کرنے والے احساسات مادام تساؤ کا چناؤ کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اب کی بار ہماری منزل مادام تساؤ میوزیم تھا۔

.....

اصل سے نقل بہتر

دنیا میں کئی مما لک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے مصروف ترین شہروں میں زیرِ زمین ٹرین چلانے کا انتظام کر رکھا ہے۔لندن کی انڈر گراؤنڈ ٹرین کا شمار ایسے ہی چند مما لک کی ٹرینوں میں نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ یہ پورے لندن میں زیرِ زمین مکڑی کے جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔روزانہ لاکھوں کی تعداد میں سیاح اور مقامی باشندے اِس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔تمام انڈر گراؤنڈ اسٹیشن ایک دوسرے سے پانچ سے دس منٹ کے فاصلے پر واقع ہیں۔اِس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اسٹیشن اُس جگہ بنایا جائے جہاں سے سیاح نزدیکی تفریحی و تاریخی مقامات اور مقامی افراد اپنی مطلوبہ جگہوں پر بآسانی پہنچ سکیں۔ ہر اسٹیشن پر ٹرین ایک سے دو منٹ کے لئے رکتی ہے۔اکثر لوگ چند ساعتوں کی دیر کرنے پر ٹرین میں سوار ہونے سے رہ جاتے ہیں۔اور لامحالہ انہیں اگلی ٹرین کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے عرصے پر محیط ہوتا ہے۔اب جبکہ ہم سردار جی سے انڈر گراؤنڈ ٹرین اور اِس کے نقشے کا استعمال سمجھ چکے تھے۔لہٰذا مادام تساؤ میوزیم تک پہنچنے کے لئے وکٹوریہ اسٹیشن پر پہنچے۔نقشے کی مدد سے مادام تساؤ کی طرف جانے والی ٹرین کا نمبر ڈھونڈا اور اپنی مطلوبہ ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔کچھ دیر بعد ٹرین تیزی سے اسٹیشن پر آ کر رکی اور ہم ٹرین میں سوار ہو گئے۔انڈر گراؤنڈ ٹرین میں بیٹھنے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا..... جو خاصا خوشگوار ثابت ہوا۔لندن کی سیر کے دوران ہم نے متعدد بار انڈر گراؤنڈ سے سفر کیا اور اِسے بیحد آرام دہ محسوس کیا۔ٹرین ہمارے اسٹیشن پر رکی تو ہم دائیں بائیں دیکھتے ہوئے باہر کو نکلے۔زینے طے کر کے اوپر کی دنیا میں پہنچے۔لندن میں اجنبی ہونے کی وجہ سے ہمیں قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت پڑتی تھی۔ایک انگریز سے مادام تساؤ کا راستہ پوچھا۔سورج سر پہ آن پہنچا تھا۔اور بدن پہ رفتہ رفتہ گرمی کا احساس طاری ہونے لگا تھا۔میوزیم کے نزدیک پہنچے تو لمبی سی ایک قطار نظر آئی۔ہم ابھی تک اِس بات سے بے خبر تھے کہ یہی مادام تساؤ ہے اِس لئے ہمارے تخریبانہ دماغ نے اِس قطار کے بارے میں مختلف پیشین گوئیاں کرنی شروع کر دیں۔ذہن میں یکدم داتا کی نگری، پاکپتن شریف اور شاہ رکن عالم دربار کا منظر آ گیا جہاں چاولوں کی تقسیم کے لئے اتنی لمبی لمبی قطاریں لگتی ہیں۔کسی کے ہاتھ میں پلیٹ نہ پا کر چاولوں کی تقسیم کا خدشہ دور ہوا تو دال بٹنے کا خیال غالب آ گیا۔کیونکہ چست کپڑوں اور چیتھڑوں میں ملبوس لوگوں میں دال پلیٹوں میں نہ سہی جوتیوں میں تو بنٹ سکتی ہے۔قطار میں کئی پاکستانی و ہندوستانی چہرے بھی نظر آئے۔قطار کے آخری امیدوار سے دریافت کیا کہ صاحب کیا ماجرا ہے؟ کس جرم کی پاداش میں آپ اخلاقی و معاشرتی قانون کی پاسداری کرتے ہوئے قطار میں کھڑے ہیں؟.....

وہ صاحب بڑی مسکین صورت بنا کر بولے..... یار میوزیم کی ٹکٹ خریدنے کے لئے کھڑا ہوں۔امید ہے کل کی ٹکٹ مل جائے گی۔

یہ مفید اور خطرناک اطلاع ہمارے لئے خدا سے اظہارِ تشکر کا باعث بنی۔ مفید اِس لئے کہ یہ کنفرم ہو گیا، مادام تساؤ میوزیم یہی ہے..... جبکہ خطرناک اِس لئے کہ اگر محمود صاحب آج سے چار دن قبل مادام تساؤ کے لئے ہماری ٹکٹیں بک کروا کر ڈاک کے ذریعے نہ منگواتے تو ہم بھی ایسی غمگین صورت بنائے قطار میں کھڑے ''آجا پردیسیا تیرا انتظار ہے'' گنگنا رہے ہوتے۔ لیکن میوزیم میں داخلے کے لئے ہمیں اِسی لائن میں کھڑا ہونا پڑا۔ جی میں آیا کہ اتنا انتظار تو آج تک ہم نے پولنگ میں اپنے امیدوار کو ووٹ ڈالنے کے لئے نہیں کیا۔ آہستہ آہستہ لوگ آگے کو سرکتے گئے اور ہماری باری آ گئی۔ ہم نے ٹکٹ چیکر کو اپنا ٹکٹ دکھایا جسے دیکھ کر اُس نے ہمارے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ٹکٹ پر سرخ رنگ کا ٹھپہ لگا دیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد پھر ایک میم صاحبہ نے آ لیا۔ انہوں نے بھی ٹکٹ چیک کیا اور ہمیں آگے کو دھکیل دیا جہاں ہماری حالت آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے کی مانند ہو گئی۔ کیونکہ اِدھر بھی میوزیم کیا اندرونی ہال میں داخلے کے لئے ایک لائن ہماری منتظر تھی۔ بچپن میں ایک سفرنامے میں مومی عجائب خانے کے عنوان سے اِس میوزیم کا حال احوال پڑھا تھا جو ہمارے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔ اُسی وقت سے اِس عجوبے کو دیکھنے کی بے حد حسرت اتھی۔ آج خدا کی مہربانی سے اُس تمنا اور خواب کی تعبیر آنکھوں کے سامنے تھی۔ ہم نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر سامنے دیکھنا چاہا تو اندر رات نظر آئی یعنی کہ اندھیرا نظر آیا۔ ہم ایک ثانیے کے لئے گڑبڑا کر رہ گئے۔ ٹکٹ چیک کروانے کے تمام مراحل میں بمشکل تمام آدھ پون گھنٹہ لگا ہو گا جبکہ ہم باہر اچھا خاصا نوخیز اور روشنی سے بھرپور دن چھوڑ کر آئے تھے۔ حیرت ہوئی کہ اتنی سی دیر میں موسم کیسے تبدیل ہو گیا۔ خدا خدا کر کے جب ہال میں پہنچے تو عقدہ حل ہوا کہ میوزیم کے کمروں کا باہر کی روشنی سے کسی طرح کا رشتہ نہیں ہے اور رات کا منظر میوزیم کے ماحول کو پرکشش بنانے کے لئے مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی ہمارے لئے انسان اور پتلے (مجسمے) میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ یہاں سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ہال کے اندر اور خاص طور پر مجسموں کے قریب چھوٹی چھوٹی رنگ برنگ بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ ماحول انتہائی سحر انگیز معلوم ہو رہا تھا۔ میوزیم میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑا کیونکہ انسان بھی آرام سے دھوکہ کھا سکتا تھا۔ ہر طرف دنیا کی معروف شخصیات کے مومی مجسمے موجود تھے۔ ایک جگہ انڈین اداکار امیتابھ بچن کا مجسمہ نظر آیا۔ اکثر لوگ امیتابھ کے مجسمے کے ساتھ تصاویر اتروا رہے تھے۔ معروف و مقبول باکسر محمد علی کا مجسمہ دیکھ کر ہٹے تو ایک بڑھیا جو کسی مجسمے کے ساتھ تصویر اتروا رہی تھی ہم اسے مجسمہ سمجھتے ہوئے غور سے دیکھنے لگے تو وہ چہک کر بولی کہ ایک طرف ہٹو..... ''میں اصل ہوں'' اور تصویر کھینچوا رہی ہوں۔ یہ صورتحال ہمارے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر ہر طرف مجسموں کا گمان ہوتا تھا۔ گاندھی کا مجسمہ بھی دیکھا۔ آگے چلے تو بے نظیر بھٹو کا مجسمہ نظر آیا۔ آج تک ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ بینظیر نے ایسا کونسا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کی وجہ سے انگریزوں نے اُن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہوئے اُن کے مجسمے کو اس میوزیم میں جگہ دی۔ ہمارے ملک کی عظیم ترین شخصیات قائداعظم، علامہ اقبال، نصرت فتح علی خان، ملکہ ترنم نور جہاں

،عمران خان بحیثیت کھلاڑی اور دوسرے بہت سے نامور لوگ جن کے کارناموں سے نہ صرف پاکستانی بلکہ پوری دنیا کے لوگ واقف ہیں ہر لحاظ سے بینظیر پر سبقت رکھتے ہیں اِن افراد کو انگریزوں نے ترجیح کیوں نہیں دی۔ان افراد کی یادگار بنانے کے لئے کوئی آواز نہیں اٹھی۔انگریزوں کی مصلحت خدا جانے کہ غیب کے حالات سے وہی باخبر ہے۔لیکن ایسے تمام قابلِ فخر پاکستانیوں کی یادگار وہاں نہ پا کر بے حد افسوس اور مایوسی ہوئی۔اِس کے علاوہ یا سر عرفات، برطانیہ کے شاہی خاندان کے افراد اور لیڈی ڈیانا کا مجسمہ قابلِ ذکر ہے۔میوزیم کے تمام کمرے دیکھنے کے بعد سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل پر آ گئے۔یہاں ایک کمرے میں پرانے زمانے کی جیلوں اور قتل گاہوں کا منظر دکھایا گیا تھا۔نوکیلے دندانوں والے دو بڑے سے رولر ایک دوسرے کے اوپر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔اِن پہیوں کی ہدایات کے طور پر یہ لکھا ہوا تھا کہ مجرم کو ان دندانوں والے دونوں پہیوں کے درمیان ڈال دیتے تھے جس سے مجرم کا جسم چیتھڑوں میں تقسیم ہو کر رہ جاتا تھا۔جیل کا منظر کچھ یوں تھا کہ جیل کا کمرہ مربع شکل میں زمین دوز بنایا گیا تھا جس کی چھت پر سلاخیں نصب تھیں۔ایسی جیلوں میں قیدی نہ ٹھیک طریقے سے بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی کیسی طریقے سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے۔لیٹنے اور ٹانگیں لمبی کرنے کے لئے ایک انچ بھی جگہ نہیں۔یہ تفصیل پڑھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ انگریز کتنے اذیت پسند ہیں۔ایک طرف یہ منظر دکھایا گیا تھا کہ آدمی کو سیدھا لٹا دیا جاتا ہے اور کلہاڑے کے پھل جیسا ایک تیز دھار آلہ اونچائی سے آ کر اُس کی گردن پر گرتا ہے جس سے مجرم کی گردن کٹ کر دور جا گرتی ہے۔اذیت ناک اور حیوانی ذہن رکھنے والے حاکموں کی یہ سزائیں دیکھ کر دل میں ہول اٹھنے لگے۔کمرہ ختم ہوتے ہی اوپر جانے کا رستہ تھا۔لوگوں کے پیچھے پیچھے ہم بھی اوپر چلے آئے۔یہاں لوگ قطار در قطار ٹکٹیں خرید کر ایک بڑے سے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔اپنی باری آنے پر ہم نے ٹکٹ خریدی اور ہال میں داخل ہو گئے۔ہال میں سینکڑوں کی تعداد میں کرسیاں سجی ہوئی تھیں۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ فلم دکھاتے ہیں۔ہال کی تمام چھت سینما کی سکرین کی طرح تھی۔فلم شروع ہونے پر ہدایت دی گئی کہ چھت کی طرف دیکھیں اِس کے بعد فلم چلنا شروع ہو گئی۔یہ خلائی سائنس پر مبنی موضوعاتی فلم تھی۔جو تمام کی تمام کمپیوٹر پر بنائی گئی تھی۔فلم میں نظامِ شمسی ،زمین کے پیدا ہونے کا عمل، سیارے، زمین چاند سورج کی گردش اور اِس کے علاوہ شہابِ ثاقب اور سیاروں کے ٹکرانے کا عمل بھی دکھایا گیا تھا۔فلم کوئی آدھ گھنٹہ چلی۔یہ سینما میوزیم کا آخری حصہ تھا۔فلم ختم ہونے کے بعد ہم واپس اٹھے اور میوزیم کے عقبی دروازے سے باہر نکل آئے۔شام کا وقت ہوا چاہتا تھا اور سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ چکا تھا۔یہ میوزیم حقیقتاً قابلِ تعریف تھا۔ہر چند کہ میوزیم کی ٹکٹ مہنگی تھی.....مگر میوزیم خاصے کی چیز تھی کہ ان رہنماؤں اور شخصیتوں کو مجسموں کی صورت ہم نے اپنے نزدیک دیکھا، جن کو ہم تا عمر ٹی وی سکرین پر دیکھتے رہے یا جن کے بارے میں آئے روز سنتے رہے۔جبکہ میوزیم بھی اپنی تشہیر کے لئے یہی نقطہ استعمال کرتا ہے۔کہ اِس میوزیم کی سیر کر کے آپ دنیا کے ان افراد کے مجسموں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں، اُن کے ساتھ تصاویر اتروا سکتے ہیں جن کو دیکھنے اور جن سے ملاقات کرنے کی آپ خواہش رکھتے ہیں۔ان مجسموں

میں اِس لئے بھی کشش ہے کہ یہ مجوزہ شخصیت سے سو فیصد مشابہت رکھتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اصل سے نقل بہتر ہے۔ مومی عجائب خانہ دیکھنے کی ہماری تمنا بھی حقیقت میں بدل چکی تھی۔ ہم مومی عجائب خانے کی سیر کر چکے تھے۔ اور اب ہمیں نئی منزل کی تلاش تھی.....

.....

پہنچے ہم منزل پہ آخرش

لندن والوں کا یہ کہنا ہے کہ کوئی شخص برسوں لندن میں رہ کر بھی پوری طرح لندن نہیں دیکھ پاتا جب کے اِسی سے ملتا جلتا خیال ہم

پاکستانیوں کا روشنیوں کے شہر کراچی کے بارے میں ہے کہ زندگی کراچی میں گزار کر بھی پورا کراچی نہیں دیکھا جا سکتا۔ہم بھی سیاحوں کے ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک کاغذ پر چار نام لکھ کر جگہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، یہ چار مقامات دیکھنے کے بعد ان کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اِس دیس کی سیر کر لی گئی ہے اور اگلے روز نئی منزل کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔مادام تساؤ سے نکلنے کے بعد ہم ٹاور برج کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ٹاور برج برطانیہ کی شناختی علامت ہی نہیں سیاحوں کے لئے ایک بے حد پرکشش مقام بھی ہے۔بڑی کشتیوں اور چھوٹے جہازوں کے گزرنے کے لئے پل درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر کے اوپر کو اٹھا لیا جاتا ہے۔نزدیکی انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کے ذریعے ہم ٹاور برج تک پہنچے۔ٹاور برج پر دیکھنے کی خاص چیزیں نہیں ہیں۔لیکن یہ پل فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ٹاور برج کے انجن روم دیکھنے اور پل کی سیر کرنے کے بعد ہم ٹاور آف لندن کی طرف چلے آئے۔سورج رفتہ رفتہ مغرب کے قدموں میں جھکتا چلا جا رہا تھا۔ہم دریائے ٹیمز کے جنوبی کنارے پر موجود تھے جہاں ٹاور آف لندن نامی قلعہ واقع تھا۔دریا کے کنارے بیٹھنے کے لئے خوبصورت بنچ بنائے گئے تھے۔ہم سستانے کے لئے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔اور دریا کا نظارہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔لوگ خوبصورت رنگ برنگ کشتیوں کے ذریعے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ارد گرد اکثر چہرے پاکستانی اور ہندوستانی نظر آ رہے تھے۔کبوتروں کے غول سیاحوں کے گرد جمع ہو کر شور مچانے میں مصروف تھے۔چند لوگ کبوتروں کو دانہ ڈالنے میں مگن تھے اور بچے بیٹھے ہوئے کبوتروں کی طرف بھاگ کر ان کو ہراساں کرنے میں مشغول تھے۔دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ہم نے بیٹھے بیٹھے ہلکی سی پیٹ پوجا کی اور ٹاور آف لندن کی طرف جانے کے لئے پر تولنے لگے۔موسم کے آثار خطرناک نظر آ رہے تھے۔بادل ہوا کے دوش پر سفر کر کے عین ہمارے سر پر جمع ہو رہے تھے۔مطلع ابر آلود ہوا چاہتا تھا۔اِس سے پہلے کہ بارش بازی جیت جاتی ہم ٹاور آف لندن نامی قلعے کی طرف جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔یہ قلعہ قدیم دور میں قیدیوں پر انتہائی تشدد آمیز مظالم ڈھائے جانے کی داستانوں کی وجہ سے خونی قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ہم ابھی چند قدم چلے ہی تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔پناہ کے لئے ارد گرد نظریں دوڑائیں تو لوگ ایک اسٹور میں داخل ہوتے نظر آئے۔چار و ناچار لوگوں کی تقلید کرتے ہوئے ہم بھی اُسی سٹور میں جا گھسے۔صاف ستھرے سٹور کا مالک گندے جوتوں اور بارش میں بھیگے ہوئے کپڑوں والے لوگوں کو سٹور میں داخل ہوتا دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا

تھا۔ہم وقت گزاری کے لئے چیزیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔چنچل لڑکے لڑکیاں پلاسٹک کے غلاف سے بدن ڈھانپے بارش میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اپنے راستوں پر جا رہے تھے۔خدا خدا کر کے بارش کا زور ٹوٹا۔سٹور کا مالک ہر شخص کو غضبناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ہم اِس غضبنا کی کی پرواہ کئے بغیر مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئے۔قلعے کے مین گیٹ پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ساڑھے سات بجے کے بعد قلعے میں سیاحوں کا داخلہ بند کر دیا جاتا ہے اور اب آٹھ بجنے کو آئے تھے۔چار و نا چار دور سے قلعے کو دیکھ کر آہیں بھرنے پر اکتفا کیا اور واپسی کے لئے چل پڑے۔صبح سے نان سٹاپ گھومتے گھماتے بدن اب جواب دے چکا تھا اور ایک پرسکون نیند کی تمنا کر رہا تھا لیکن ابھی ایک جستجو اور باقی تھی۔لندن میں ہمارا قیام برادرم عزیز کے گھر پر تھا۔ایک فون بوتھ سے فون کر کے اُن سے گھر کا ایڈریس پوچھا۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ لندن بارکنگ میں ان کی رہائش ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک ٹرین کا نمبر بتا دیا۔شاید ان کے بتانے میں غلطی تھی یا ہم صحیح نہ سن سکے کہ جب ہم بیس منٹ کا سفر کر کے وہاں پہنچے تو اکا دکا افراد اسٹیشن پر نظر آ رہے تھے۔اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت کے ساتھ ساتھ ٹکٹ چیک کرنے والی مشینیں بھی بند پڑی تھیں۔ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم ضرور غلط والے لندن بارکنگ پہنچ گئے ہیں۔فون کر کے پھر عزیز بھائی سے پوچھا تو انہوں نے کسی سے پوچھ کر ہمیں دوبارہ ٹرین کا نمبر بتایا۔ٹرین کے انتظار میں ہم اسٹیشن کے چھوٹے سے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بیس منٹ میں ہم ایسے بھرے پرے شہر سے دور ویرانے میں کھڑے ہونگے۔اسٹیشن کی پرسکون خاموشی میں بے حد مزا آ رہا تھا۔رات کے سکوت اور سحر انگیز کیفیت میں جو چاشنی ہوتی ہے وہ لطف کسی حسین وادی کے سرسبز درختوں کی چھاؤں میں جھیل کنارے بیٹھ کر سوچوں کے گھوڑے دوڑانے میں بھی نہیں ہے۔پاکستان میں رات کے وقت سڑک کنارے ٹہلنا معمولات میں شامل ہے۔ایسے میں ہوا کے شرارتی جھونکے ساکت ماحول کی پراسراریت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔جبکہ ٹمٹماتے جھلملاتے ہوئے ننھے منھے ستاروں کو دیکھ کر خدا کی وحدانیت اور قدرت کی حسن شناسی کا اقرار کرنے کو جی چاہتا ہے۔اسی اثنا میں ہماری مطلوبہ ٹرین آن پہنچی اور ہم واپسی بیس منٹ کا سفر طے کر کے مطلوبہ اسٹیشن پر پہنچے۔لوگوں کی بھیڑ میں عزیز کا چہرہ تلاش کیا اور اُن سے ملتے ہی اپنے بھٹکنے کی روداد سنانے لگے۔عزیز کے گھر والے آج رات کسی تقریب میں شرکت کے لئے باہر گئے ہوئے تھے اور موصوف گھر میں تنہا تھے۔انہوں نے ہماری ضیافت کا اہتمام از خود قورمہ، پلاؤ، اور دوسری ذائقے دار ڈشیں بنا کر کیا ہوا تھا۔کھانے کے بعد رات گئے تک خوش گپیاں جاری رہیں۔گھر سے دور کسی دوسرے دیس کی خاک چھانتے ہوئے اگر اپنے گھر جیسی کوئی جگہ مل جائے تو انسان تھکاوٹ اور مشکلات کو بھول کر آنے والے سفر کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے۔چونکہ اگلے روز ہمیں پھر سے آوارہ گردی کے لئے نکلنا تھا اس لئے اب نیند کی گود میں سر رکھ کر سو جانا ہی بہتر تھا۔

.....

ابھی کچھ عزت باقی تھی

قدرت نے حسن و جمال سے لبالب اِس دنیا اور کائنات کو عیاں کرنے کے لئے انسان کو فہم و فراست اور عقل و شعور عطا کیا ہے۔حیران کن رازوں سے لبریز دنیا کو کس نظر سے دیکھنا ہے یہ جاننا ہر انسان کی بساط میں ہے۔دنیا کی خوبصورتی کو افشاں کرنے کے لئے مغرب کی مہذب کہلانے والی قوموں نے اپنے ملکوں میں سیاحوں کی تفریح کے لئے نئے سے نئے راستے دریافت کر رکھے ہیں۔بلاشبہ لندن ایک مصروف شہر ہے۔دنیا جہان کے سیاحوں کا محور و مرکز ہے۔تاریخی، سیاسی، ثقافتی، سیاحتی اور دیگر تفریحی لوازمات سے بھرپور اِس شہر کو ایک ہی نظر میں نظر بھر کے دیکھنے کے لئے ''لندن آئی'' جیسا مشاہداتی پہیہ بنایا گیا ہے۔خوبصورت اور جدید خطوں پہ استوار اِس رائیڈ کو بنانے کے لئے کم و بیش سات سال کا عرصہ درکار تھا۔یہ بلند ترین جھولا چار سو پچاس فٹ کی بلندی سے لندن اور لندن والوں کو دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔اپنے مرکز کے گرد آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے گھنٹہ بھر میں یہ جھولا ایک چکر کاٹ کر سیاحوں کو واپس زمین پر لا کھڑا کرتا ہے۔لندن آئی سے نظارہ کرنے پر وسیع و عریض لندن آپ کے سامنے عیاں نظر آتا ہے۔وہ مقامات جنہیں دیکھنے کے لئے ٹرین کا سفر کرنا پڑتا ہے ایک دوسرے کے نزدیک سر اٹھائے کھڑے نظر آتے ہیں۔ٹیمز کے دوسرے کنارے پر بگ بین اور پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت ہماری منتظر نظر آ رہی تھی۔لندن آئی کے بعد ہمارا ارادہ بگ بین دیکھنے کا تھا۔رفتہ رفتہ ہم زمین کے قریب تر ہوتے چلے آئے۔اترنے کے بعد ٹھنڈے پانی کی بوتل خرید کر پیاس بجھائی اور بگ بین کی طرف چل دیئے۔

موسم خوشگوار تھا.....آسمان پر جا بجا بادلوں کی موجودگی بارش کا پیغام سناتی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ہم بگ بین کے سامنے اور ٹیمز کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے بگ بین کا نظارہ کر رہے تھے۔تین سو پندرہ فٹ بلند اِس کلاک ٹاور کو 1858 سے 1859 کے درمیان مکمل کیا گیا۔اس ٹاور کے کلاک کا وزن 13 ٹن ہے۔گھڑی کا ہر ہندسہ 2 فٹ لمبا ہے اور ہر ہندسے کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ ہے۔کلاک کی تاریخ اور تعمیر کے بارے میں مختلف کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔سامنے سڑک پر بے انتہا ٹریفک تھی۔دریا میں تیرتی ہوئی کشتیوں میں سیاح کھاتے پیتے اور ہنستے کھیلتے نظر آ رہے تھے۔بگ بین کے بارے میں سن اور پڑھ کر جس قدر دل میں شوق سمایا تھا آج اس کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ہم اطمینان سے چھاؤں میں بیٹھے ٹریفک دیکھتے رہے، بگ بین دیکھنے کے لئے آنے والے سیاحوں کا مشاہدہ کرتے رہے۔یہاں سے دور دریا کے دوسرے کنارے پر لندن آئی ابھی تک آہستہ آہستہ اپنے مرکز کے گرد چکر لگا رہا تھا۔کیا خبر جھولے میں بیٹھے کتنے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہوں جیسے کچھ دیر قبل ہم جھولے میں بیٹھے یہاں کے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔دریاؤں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے.....اپنی داستانیں ہوتی

ہیں۔دریا کے قریب رہنے والے باسیوں کی اپنی داستانیں ہوتی ہیں۔جن میں دریاؤں سے وابستہ تاریخ شامل ہوتی ہے۔ایسی جادو بھری داستانیں بڑے بڑے شہروں میں کبھی سننے کو نہیں ملتی۔اگر دریاؤں سے منسوب کہانیاں جاننی ہوں یا دنیا سے بے نیاز چرواہوں کو دریا کنارے بکریاں چرانے کے دوران بانسری بجاتے ہوئے اور لوک گیت گاتے ہوئے سننا ہو یا دریائی علاقوں کے نغموں کی تانوں پر مسحور ہونا ہو تو انسان شہر سے دور دریا کنارے بسی ہوئی بستیوں اور گاؤں کا سفر کرے جہاں کے لوگ نہ صرف دریاؤں کے پانی کی خوبصورت بلکہ ظالم داستانیں بھی سناتے ہیں۔

پارلیمنٹ کی عمارت کے ساتھ مشہور قبرستان ویسٹ منسٹر ابے تھا۔قبرستان کے داخلے دروازے پر تعمیراتی کام جاری تھی جس کی وجہ سے ہم اس کے بارے میں مزید نہ جان سکے۔

ساتھ ہی مشہورِ زمانہ 10 ڈاؤننگ اسٹیٹ واقع تھی۔اتنی دیر میں بارش شروع ہو چکی تھی۔ہم پاکستانی لوگ ہلکی بارش اور بادلوں والے موسم کو رومانٹک موسم خیال کرتے ہیں۔ہمارے ہاں ایسے دلفریب موسموں میں سرد مزاج دلوں پہ بھی مستی چھائی ہوتی ہے.....حساس شاعر ایک خوبصورت رومانوی غزل اور مصور ایک باکمال تصویر تخلیق کرتا ہے۔بارش والے دن باقاعدہ گھروں میں پکوڑوں اور سموسوں کا اہتمام کر کے موسم کا لطف دوبالا کیا جاتا ہے۔لوگ سڑکوں اور میدانوں میں ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں۔پانی کو ترسے ہوئے کسانوں کے لئے عید کا سامان ہوتا ہے۔مگر اس وقت ہمیں بارش بے حد ناگوار گزر رہی تھی کیونکہ کم سے کم وقت میں ہمیں زیادہ سے زیادہ مقامات پر حاضری دینی تھی۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ رعنائیوں سے بھرپور اس شہر میں ہفتوں گذار دیتے لیکن اِس کے لئے ایسے سرد موسم میں بھی جیب کا گرم ہونا ضروری تھا۔پاکستان میں ہم نماز استسقاء پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں اور یہی نعمت اس وقت ہماری طبیعت پر گراں گذر رہی تھی۔اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹ کو بھلا کوئی انسان کیونکر پسند کر سکتا ہے۔بارش تھمنے کے بعد ہم 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ (ٹن ڈاؤننگ اسٹریٹ) کی طرف ہو لیے۔یہ اسٹریٹ وزیراعظم اور دوسرے سینئر حکومتی ارکان کے سرکاری دفاتر و رہائشگاہ کی وجہ سے شہرت رکھتی ہے۔اِن دنوں یہ خبر گرم تھی کہ برطانیہ نے پاکستان سے آنے والے طلباء اور مسافروں کا داخلہ محدود کر دیا ہے۔اب اِن گوروں کو کیسے سمجھایا جائے کہ ایسا کرنے سے ان کی درجنوں خواتین کنواری رہ جائیں گی۔یہ بات ہم وزیرِ اعظم ٹونی بلیئر ڈ کو سمجھانا چاہتے تھے مگر وہ شاید سمجھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اسٹریٹ کے اردگرد آزادی سے آوارہ گردی کرنے کے دوران کسی دفتر یا عمارت کا دروازہ نہ کھلا اور نہ ہی کسی سپاہی نے کسی کونے کھدرے سے نکل کر پاکستانی کی ہانک لگاتے ہوئے ہمیں ہتھکڑیوں کا جلوہ دکھایا کیونکہ ابھی نائن الیون کا حادثہ وقوع پذیر نہ ہوا تھا.....ابھی کچھ عزت باقی تھی۔

.....

ایک آزاد تفریح گاہ

دنیا میں بے شمار تفریح گاہیں اور پارک موجود ہیں مگر جو مقبولیت لندن کے ہائیڈ پارک کے دامن میں آئی وہ کسی دوسرے تفریحی مقام کا حصہ نہ بن سکی۔ بارش ختم ہونے کے بعد بادل چھٹنے لگے اور موسم خوشگوار ہوا تو سورج نے بھی اپنے چہرے سے آنچل سرکانا شروع کر دیا۔ ایسے میں قدیم عمارات، سڑکیں، پھول کلیاں اور ہر شے اجلی اجلی نکھری سی نظر آنے لگی۔ ہم ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پارک میں داخل ہوئے کیونکہ ہم سیر کرنے سے پہلے ارد گرد کا جائزہ لے کر پارک کے بارے میں ایک ذاتی رائے قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ ہفتے کے درمیانی دنوں میں دفتری مصروفیات کا وقت تھا اور ہر شخص اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرنے میں مصروف تھا۔ اُس وقت جہاں میں صرف ہم فارغ البال اور فارغ العقل تھے کہ اِس وقت ہائیڈ پارک دیکھنے چلے آئے تھے۔ پارک سنسان دکھائی دے رہا تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹے ہر آنے جانے والے شخص کو دیدے مٹکا مٹکا کر دیکھتے تھے۔ پارک میں تنہا پڑے بینچ لوگوں کی راہ تکتے تھے۔ پارک کا خاموش دروازہ ٹھٹھے اڑانے والے گروہوں اور بے معنی شور کرنے والے مقرروں کا منتظر تھا۔ ہمیں اپنے علاوہ چند افراد درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے اور لیٹے ہوئے نظر آئے۔ لوگ شام کے وقت یا ویک اینڈ پر پارک کا رخ کرتے ہیں اور بے معنی، مضحکہ خیز تقاریر کر کے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ اِس پارک کی وجہ شہرت اور خوبی ہی یہی ہے کہ آپ اس پارک کے اندر کسی قسم کی کوئی تقریر کر ڈالیں، کسی سیاستدان یا کسی بھی ملک کے بارے میں جھوٹے سچے قصیدے پڑھ ڈالیں کوئی آپ پر انگلی تک نہ اٹھائے گا۔ جی میں آیا کہ وہ سب مواد یا بھڑاس جو ہم اپنے ملک کے بیوقوف سیاستدانوں اور قانون بنانے والے حکمرانوں کے لئے اپنے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج یہاں نکال ڈالیں لیکن سامعین کی تعداد انتہائی ناقص تھی مزید یہ کہ کم از کم اس پارک کے قوانین پاکستان کے تھانوں، جیلوں اور ایوانوں میں لاگو نہ ہوتے تھے اس لئے دم سادھ لینے میں ہی عافیت جانی۔ گورے شام کے وقت پارک کا رخ کرتے ہیں جہاں معمر افراد ایک دوسرے کو بمشکل پہچان کر بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہیں..... باقاعدگی سے پارک کی سیر کو آنے والی کسی عمر رسیدہ گوری یا بوڑھے کے ناغہ کرنے پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور جوانی میں کئے گئے اپنے لاتعداد عشق کے قصوں کو بیاں کرتے ہوئے نازاں ہوتے ہیں۔ سارے جہاں کے حالات پر بحث کر کے اور اپنی اَن گنت تاریخ ساز محبتوں کے دوران کی گئی چالاکیوں، اٹھکیلیوں کے خوشنما واقعات سنا کر سارے دن کی تھکان اتارتے ہیں۔ ویک اینڈ پر اکثر افراد سپیکروں پہ تقریریں کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کو سننے والے گنتی کے چند افراد ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص اپنی اپنی ہانکنے میں مگن ہوتا ہے۔ پارک میں گھڑ سواری کے لئے بہترین ٹریک بنا تھا۔ جھیل میں کشتی رانی کی سہولت بھی حاصل تھی۔ پارک میں اکثر اوقات مختلف تفریحی سرگرمیاں

منعقد ہوتی ہیں جن میں میوزیکل شوز بھی شامل ہیں۔شہر کے درمیان سرسبز وشاداب اور ہرے بھرے درختوں سے لیس یہ سب سے بڑا گارڈن ہے۔اِس وقت پارک میں کچھ بوڑھوں، سرسبز درختوں، بیل بوٹوں اور پانی کے سوا کچھ نہ تھا سو تھوڑی دیر چہل قدمی کرنے کے بعد ہم نے ٹریفلوگر سکوائر کی راہ لی۔

.....

چند سکوں کے عوض

لندن میں ٹاور برج کے بعد جس معروف ومقبول مقام کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ ٹریفلوگر سکوائر ہے۔ مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک انتہائی مصروف مقام بھی ہے۔ کیونکہ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں سیاح نظر آتے ہیں۔ ہائیڈ پارک سے نکلنے کے بعد ہم ٹریفلوگر سکوائر کی طرف چلے آئے۔ فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے ایک طرف سستے مال کی ایک چھوٹی سی مارکیٹ نظر آئی، لگے ہاتھوں یہ سستی دکانیں دیکھ لینے میں کوئی حرج نظر نہ آیا سو چلتے چلتے مارکیٹ پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اپنی امارت کی فقیرانہ مثالیں دینے کے لئے بے حساب واقعات ہیں جو ان صفحات کی زینت بن سکتے ہیں لیکن اِن سودمند واقعات کی تفاصیل ہم کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں تا کہ متعلقہ لوگوں کے کام آسکیں۔ ہر چند کہ ابھی سورج آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا لیکن ٹریفلوگر سکوائر کے احاطے میں سیاحوں کی کثیر تعداد نظر آرہی تھی۔ سکوائر کے درمیان میں خوبصورت فوارے نصب تھے جن کے گرد لوگ بیٹھے ہوئے کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ چھوٹے بچے فوارے کے پانی سے کھیلتے ہوئے کبوتروں کو تنگ کرنے میں مصروف تھے۔ ٹریفلوگر سکوائر کے احاطے میں ہر طرف بے حساب کبوتر پَر پھڑ پھڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی کبوتر اِس سکوائر کی شہرت اور سیاحوں کے لئے کشش کا باعث ہیں۔ اِن کبوتروں کو ہاتھ، پاؤں یا کسی بھی طریقے سے ڈرانے کی ہر کوشش بالکل بے سود ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ اپنی جگہ سے خوفزدہ کر اڑنا تو درکنار آنکھیں جھپکنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ لوگ کبوتروں کو چاول اور دانہ ڈال رہے تھے۔ اس کارِ خیر میں ہم نے بھی تھوڑا سا حصہ لیا۔ فواروں کے نزدیک پہنچے تو پانی کی تہہ میں لاتعداد چمکتے ہوئے سکے پڑے نظر آئے۔ سوچا کہ شاید گورے بھانج جیب میں رکھنے کے روادار نہیں ہوتے اور فواروں میں پھینک دیتے ہیں کہ شاید ہم جیسے کسی مفلس نادار کا بھلا ہو جائیگا مگر یہ سوچنے کی بات ہے کہ برس ہا برس سے پھینکے گئے سکے ڈھیر کی صورت اختیار کرنے کی بجائے کدھر گئے۔ ہم ان سکوں کی بابت یہی جان سکے کہ پردیس کی سیر کو جانے والے لوگ یہ سوچ کر فواروں اور پانیوں میں سکے پھینکتے ہیں کہ وہ پھر کسی دن لوٹ کر دوبارہ اِس دیس کی سیر کو آسکیں گے۔ اِسی لئے سیاح ٹریفلوگر سکوائر کے ان فواروں میں بھی سکے ڈالتے ہیں۔ اس نیت کے ساتھ کہ خداوند کریم، وہ مقدس ذاتِ باری تعالیٰ پھر کبھی ہمیں اِس دیس کی سیر پر آنیکا موقع فراہم کرے گا، ہم نے بھی چھوٹی قیمت کے چند سکے پانی کی نذر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی سوچ میں گم تھے کہ فواروں سے ہٹ کر ایک طرف بلند سا مینار نظر آیا۔ سکے پھینکنا بھول کر ہم مینار دیکھنے لگے۔ معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ ٹریفلوگر سکوائر نیوی کے ایک افسر ایڈمرل نیلسن کی تاریخی مفتوحات کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہی نیلسن جس کے بحری جنگی کارناموں سے انگریزوں کی سنہرے حروف والی کتاب کا ایک حصہ بھرا پڑا ہے۔ اس مینار کی بلندی کم وبیش ایک سو پچاسی

فٹ ہے اور مینار کے اوپر نیلسن کا سترہ فٹ اونچا مجسمہ نصب ہے۔ مینار کے گرد بڑے بڑے چار شیروں کے کالے مجسمے نصب کئے گئے ہیں۔ دن میں ہر وقت سکوائر میں سیاحوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ ہماری طرح اکثر سیاح سارا دن شہر کی آوارہ گردی کے بعد شام چار پانچ بجے ٹریفلوگر سکوائر کا رخ کر رہے تھے۔ تاکہ یہاں بیٹھ کر، ہنستے کھیلتے مسکراتے چہرے دیکھ کر سارے دن کی تھکان دور کر سکیں۔ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ کر لوگوں کو فواروں کے پانی سے شرارتیں کرتے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو کبوتروں کے ساتھ محوِ طعام دیکھ کر انسان کی بوجھل طبیعت سے تھکاوٹ کی تمام تر تہیں اتر جاتی ہیں۔ خوشنما سفید رنگوں والے کبوتروں اور انسانوں کی دوستی کے نظارے قلب کو تسکین پہنچاتے تھے۔ یہی کبوتر انسانی بازوؤں، کندھوں حتیٰ کہ سر پر بیٹھ کر چہچہاتے ہیں مگر اس کے لئے انسان کو مجسمے کی طرح ساکت ہونا پڑتا ہے۔ سکوائر کی فضا میں غول کی صورت چکر کاٹنے والے کبوتر ہر سیاح کو خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں۔ بہت سے بچے والدین کے منع کرنے کے باوجود گھٹنوں پانی میں اتر کر یا پانی میں ہاتھ ڈال کر سکے نکال لیتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے سکے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ٹریفلوگر سکوائر کی مقبولیت حقیقت پر مبنی ہے کہ یہاں بھانت بھانت کے سیاحوں کی کھچڑی پکی ہوتی ہے، نئے رنگ کے لوگوں کو دیکھ کر نئے نئے دیسوں کی سیر کی منصوبہ بندی کرنے کو جی چاہتا ہے، احساس ہوا کہ لندن کی سیر کے دوران

سب سے زیادہ لطف یہیں آیا، ہم آہستگی سے اٹھے، چھوٹے قدموں کے ساتھ فواروں تک پہنچے، آنکھیں بند کیں اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے سکے ہاتھ میں آئے وہ پانی کی نذر کر دیئے۔ چند سکوں کے عوض ہی سہی، ہم واقعی لندن دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔

.....

لندن کی گلیاں

ٹریفلوگر سکوائر کو دوبارہ لوٹ کر آنے تک کے لئے خدا حافظ کہہ کر ہم پکاڈلی کو چلے آئے۔ پکاڈلی، آکسفورڈ، ریجنٹ، ایک دوسرے کے قریب واقع یہ لندن کی مہنگی ترین سڑکیں اور گلیاں ہیں۔ یہی وہ گلیاں ہیں جہاں سے دنیا کا ہر جدید فیشن جنم لیتا ہے۔ انہی سڑکوں کی رونق اور شہرت کو دیکھ کر امریکہ کی رال ٹپکتی ہے۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں گندمی رنگ والے افراد قلیل تعداد میں نظر آئے۔ اور یہی وہ مصروف و معروف شاہراہیں ہیں جہاں کی مارکیٹوں اور دکانوں میں شہزادوں، لارڈز، اور بڑے بڑے افسروں حکمرانوں کی جیبیں اپنی محبوباؤں، سیکرٹریوں اور بیویوں کے لئے خالی ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی مہنگی ترین، فیشن ایبل اور مشہور درزیوں کی دوکانیں انہیں گلیوں سے منسوب ہیں۔ چونکہ رات کے سائے خطہ زمیں کو اپنے آنچل سے ڈھانپ چکے تھے اس لئے ہر سڑک برقی قمقموں سے مزین نظر آ رہی تھی۔ پکاڈلی کی سڑک کنارے دنیا کے مشہور ترین شاپنگ اسٹور واقع ہیں۔ ہم پکاڈلی سے ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے آکسفورڈ اور ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف نکل آئے۔ اپنی استطاعت میں محض خالی نظروں سے دیکھ کر آہیں بھرنا ہی شامل تھا۔ ہر نئے آنے والے دن آکسفورڈ اور ریجنٹ کی گلیوں سے نیا فیشن نمودار ہوتا ہے۔ اسی انفرادیت اور جدیدیت کی بنیاد پر یہ گلیاں دنیا کی مہنگی ترین اسٹریٹس کہلاتی ہیں۔ ہر چند کہ ہم ان گلیوں میں گھومتے ہوئے کئی دوکانوں کے شوکیس میں پڑے خوبصورت لباس دیکھ کر اندر داخل ہوئے، کئی چیزوں کی قیمتوں کا موازنہ ملکی مصنوعات سے کیا، ہر پاکستانی کی طرح سینکڑوں پاؤنڈز کی رقم کو روپوں میں تبدیل کر کے دیکھا اور نتیجے کے طور پر دوکاندار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ اس نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دی، باعزت طریقے سے باہر نکل آئے کیونکہ مزید آوارہ گردی کرنے کے لیئے جیب بھاری رکھنا اشد ضروری تھا۔ اگلے روز ہمیں پیرس کی بس پکڑنی تھی اس لئے ہم خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے کہ خوشبوؤں کا دیس ہمارا منتظر ہے۔ رات کا کھانا برادرم عزیز کے ہاں سیر ہو کر کھایا کیونکہ سارے دن کے بعد اِس وقت گھر جیسا کھانا نصیب ہوا تھا۔ رات گئے تک خوش گپیاں جاری رہیں۔ اور پھر فواروں میں سکے پھینکنے اور مہنگی دوکانوں سے کوٹ پتلون خریدنے والے خواب دیکھنے کے لئے ہم میٹھی میٹھی نیند کو گلے لگا کر بستر پر دراز ہو گئے۔ اپنی استطاعت میں تو یہی کچھ تھا.....

.....

قصہ یہ حیرتوں کا، عالم یہ غیرتوں کا

مادام تساؤ کے اِس شہر میں ہمارا آخری دن تھا۔ کہتے ہیں اگر کوئی جگہ خوبصورت لگے یا کسی جگہ پر کوئی خوبصورت لگے تو واپس لوٹ آنے کو دل نہیں کرتا۔ کچھ ایسی ہی صورتحال دلِ نادان سے وابستہ تھی۔ حالانکہ قابلِ دید مقامات کے ایک لامتناہی سلسلے سے یہ شہر بھرا پڑا تھا مگر اِس شہر سے کوچ کرنا بہر حال قسمت میں لکھا تھا۔ سو ہم بھی صبح سویرے عزیز بھائی کو خدا حافظ کہتے ہوئے ،سامان کمر پر لادے شہر گردی کو نکل کھڑے ہوئے۔ ہمیں شام کو پیرس کے لئے وکٹوریہ بس اسٹیشن سے بس پکڑنا تھی اور تب تک کا وقت گمشدہ جانور کی طرح ادھر ادھر سڑکوں پر دندناتے ہوئے گزارنا تھا۔ لندن کے ان گنت میوزیمز کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا سو یہ دن میوزیمز کے لئے موقوف کر دیا۔ ٹرانسپورٹ میوزیم، سائنس میوزیم، نیچرل ہسٹری میوزیم، آرٹ میوزیم، اور نجانے کیسے کیسے لاتعداد میوزیمز شہر لندن کے ہر پانچویں موڑ پر موجود ہیں۔ امریکہ سے قبل جب تمام دنیا پر انگریزوں نے اجارہ داری قائم کی ہوئی تھی، ہر دیس ہر سمندر میں لوٹ مچا رکھی تھی۔ بیشتر ممالک کے نظام میں انگریزوں کا کسی نہ کسی طریقے سے عمل دخل شامل تھا، اُس وقت اِن گوروں نے تمام دنیا سے عجائبات اور خوبصورت اشیاء لوٹ لوٹ کر اپنے ملک میں جمع کیں، میوزیم تعمیر کئے ، اور اِن تمام اشیاء کو اپنی ملکیت بنا لیا۔ نہ صرف منفی طریقوں سے بلکہ مثبت طریقوں سے بھی انگریزوں نے اپنے ہاں میوزیمز قائم کرنے کو فروغ دیا۔ تحقیقات کیں، کائنات کے ذرے ذرے کو تجربات کے سلسلوں سے گزارا اور اپنے ہر تجربے کو تاریخی و ملکی اثاثہ سمجھ کر محفوظ کیا جس کی وجہ سے آج اِس قوم کا ہر فرد سائنسی لحاظ سے باقی دنیا سے آگے ہے۔ ہم نے جن میوزیمز کا انتخاب کیا وہ ایک ساتھ ایک ہی سڑک پر واقع تھے، وقت کی کمی کے باعث ہمارے پاس کوئی دوسرا انتخاب نہ تھا ۔ ہماری سب سے پہلی منزل ''نیچرل ہسٹری میوزیم'' تھی۔ گدلا گدلا موسم دل کو بے حد سرور پہنچا رہا تھا۔ ہمارے علاوہ سیر پر آنے والے دوسرے سیاح میوزیم کے سامنے والی سڑک کے کنارے بچھے ہوئے بنچوں اور گھاس پر بیٹھ کر میوزیم کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میوزیم کھلتے ہی لوگوں کا ایک ہجوم دروازے کی طرف لپکا۔ باوجود پاکستانی ہونے کے ہم شتر مرغ کی طرح گردن اٹھائے بے صبری سے پہلو بدلتے ہوئے قطار میں کھڑے رہے اور ٹکٹ کے لئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ اٹھارہ سال سے کم عمر افراد کے لئے یہاں تقریباً تمام میوزیمز میں ٹکٹ فری ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ویک اینڈ پر سستی تفریح حاصل کرنے والے لڑکے لڑکیوں کی وجہ سے میوزیمز بھر جاتے ہیں۔ یہ میوزیم جس کا ہم نے ایک سرسری جائزہ لیا ، دنیا ، کائنات، حیوانات، زمین، زمین کے خدوخال، سمندر اور اِس کی اندرونی ساخت اور اس طرح کی بیشتر انہونی معلومات سے مزین تھا۔ ہر چیز حیرت انگیز طور پر اپنے اندر ایک حقیقت اور خوبصورت راز سموئے ہوئے تھی۔ قدرت کی صناعی سے لبریز ہر

سنگ وستارہ انسان کو حیرتوں کے سمندر میں ڈبو دیتا تھا۔ ہر موتی ہر سیپ میں نیا رنگ، ہر شاخ ہر بوٹے میں نیا ڈھنگ تھا۔ انسان قیامت کے آخری لمحے تک بھی کائنات کو پوری طرح افشاں نہیں کر سکتا، تسخیر کرنا تو پھر ایک ناممکن ترین بات ہے۔ میوزیم میں مختلف سیکشن اور راہداریاں بنی ہوئی تھیں۔ فاسلز کیا ہیں۔ زمین کیا ہے، کب معرضِ وجود میں آئی، کل کیا ہو گی، زلزلے کب، کیسے اور کیوں آتے ہیں زلزلہ آنے کا باقاعدہ عمل کر کے دکھایا گیا تھا جس کے لئے ہمیں لوہے کے ایک بڑے تخت پر کھڑا ہونے کو کہا گیا، سامنے ایک سکرین پر زلزلے کی فلم چلا دی گئی۔ جیسے جیسے فلم میں زلزلہ پیش رفت کرتا، ویسے ویسے لوہے کا یہ تخت زور زور سے لرزنے لگتا تھا۔ اِس کے علاوہ زلزلے کی شدت اور اِس سے ہونے والی تباہی بھی سکرین پر دکھائی گئی۔ اِس کے علاوہ دنگ کر دینے والے ایسے بیسیوں مقامات تھے کہ انسان وہاں بت بنا، آنکھیں پھاڑے کھڑا رہتا ہے، خالق کو سوچتا ہے۔ اُس کی باکمال تخلیق پر انگشتِ بدنداں رہ جاتا ہے اور پھر بے اختیار دل سے سبحان اللہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ادھ کھلے رازوں کے ہزاروں نامکمل ابواب دل میں لئے جب ہم میوزیم سے باہر نکلے تو سورج کی چند چنچل کرنیں اپنے راستے میں حائل بادلوں کا حصار توڑ کر زمین تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ باوجود سورج کی اِن چند کرنوں کے موسم تا حال خنک تھا ''جیسے بے موسمانہ بارش میں نہائی ہوئی کسی نوخیز حسینہ کا بدن اور اس سے اٹھتی ہوئی سحر انگیز مہک اور اس کے گرم گرم لمس کا احساس''.....اپنے ملک میں رہتے ہوئے موسموں کی شطرنج کچھ خاص لطف نہیں دیتی.....لیکن دورانِ سفر موسموں کے ہزاروں رنگ مسافر کو اپنے خوبصورت گھیرے میں لے لیتے ہیں اور جیسے ہوا کا ایک گول جھونکا ایک مخصوص دائرے اور محور میں زمین سے فضا تک گھومتا ہوا مٹی کو دور تک لے جاتا ہے، ایسے ہی رنگ برنگ چلبلے موسم سیاح کو اپنی گود میں بٹھا کر اَن دیکھی وادیوں کے دامن میں پہنچا دیتے ہیں اور انسان بے اختیار لطف و سحر کے جام میں ڈوب جاتا ہے.....

نیچرل ہسٹری میوزیم سے ذرا فاصلے پر وکٹوریہ آرٹ میوزیم اور سائنس میوزیم تھا۔ سائنس میوزیم کے باہر شائقین اور سیاحوں کی ایک بڑی قطار نظر آ رہی تھی۔ ہم کچھ دیر کے لئے ٹھنڈے ٹھنڈے موسم سے لطف اندوز ہوتے رہے، اور میوزیم کے اردگرد رقصاں زندگی دیکھتے رہے۔ میوزیمز کی قدیم عمارات میں ایک اجنبی سی کشش تھی۔ لندن کی بیشتر عمارات عیسائی مذہب اور انگریزوں کے مخصوص فنِ تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ ہم وکٹوریہ البرٹ میوزیم کی طرف چل دیئے۔ آرٹ کا یہ میوزیم دنیا کے چند بڑے آرٹ میوزیمز میں سے ایک ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی میوزیم کے عملہ نے تین چار تعارفی پمفلٹ تھما دئے جس کے ذریعے ہم نے میوزیم کے بارے میں سرسری معلومات حاصل کیں تا کہ میوزیم کے مختلف حصے دیکھنے میں آسانی ہو۔ یہ میوزیم 145 گیلریوں پر مشتمل تھا۔ 1852 میں ایک تصویری نمائش سے متاثر ہو کر قائم کیا جانے والا یہ میوزیم لاکھوں پینٹنگز اور تصاویر پر مشتمل ہے۔ اِس میوزیم کو دنیا کا سب سے بڑا آرٹ میوزیم ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ پانچ چھ منزلہ اِس میوزیم میں چند گیلریاں دیکھنے کے بعد ہم واپس کو ہو لئے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے ہر جگہ کو وقت دینا تھا اور ہم تفصیلی مشاہدے کرنے

کی بجائے سرسری جائزہ لینے پر مجبور تھے۔اب کی بار ہم سائنس میوزیم کی طرف چل پڑے۔سائنس میوزیم میں لوگوں کی تعداد پچھلے دونوں میوزیمز سے کہیں زیادہ تھی۔چونکہ اٹھارہ سال سے کم عمر افراد کے لئے ٹکٹ مفت تھی۔اِس وجہ سے سکول کالجز کے لڑکے لڑکیوں کے جوڑے کثیر تعداد میں نظر آ رہے تھے۔میوزیم کیا تھا؟ سائنس کا ایک وسیع خزانہ تھا۔چھوٹی سی مشینری سے لے کر سٹیم انجن اور بڑے بڑے کارخانوں میں استعمال ہونے والی مشینیں تک موجود تھیں۔لطف کی بات تو یہ تھی کہ محض ایک بٹن دبانے سے یہ تمام مشینیں سبک رفتاری سے اپنے طریقہ کار کے مطابق چلنے لگتیں تھیں جس سے دیکھنے والے کو اِن مشینوں کے کام کرنے کا طریقہ سمجھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ماضی کی تین پہیوں والی گاڑی سے لے کر خلائی جہاز تک نمائش کے لئے رکھے گئے تھے۔بچوں کے لئے کمپیوٹر گیمز اور تفریح کی دیگر سہولیات میسر تھیں۔اپنے تاثرات درج کرنے کے لئے بے شمار کمپیوٹر لگائے گئے تھے۔بچے بوڑھے سب ہنستے کھیلتے نظر آ رہے تھے۔بلا شبہ گوروں نے علم و تحقیق کے میدان میں دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔جن کتابوں کو ہم نے دریا برد کیا اور پھاڑ کر پھینک دیا، اِنہوں نے اُنہیں اوراق کو جوڑ کر اور سُکھا کر اپنے بچوں کو پڑھایا۔کتابیں اسلام کے جید سائنسدانوں نے لکھیں، خیالات مسلمانوں نے پیش کئے، عمل اِنہوں نے کیا.....علم مومن کی میراث تھی غیر مسلموں نے اِس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔کتاب کو ردی کاغذ سمجھ کر کوڑے میں پھینکنے یا سموسوں پکوڑوں کی پلیٹ میں رکھنے کی بجائے غیر مسلم دنیا نے اسے سٹڈی ٹیبل اور الماریوں میں جگہ دی۔علم کو عزت و حرمت دینے کے باعث ہی یہ لوگ تحقیق و تنقید کے میدان میں دنیا کی باگ ڈور تھامے ہوئے ہیں۔اور ہم سب تیسری دنیا کے باسی سر جھکائے اِن کے پیچھے پیچھے..... خراماں خراماں.....زینے سے نیچے اتر رہے ہیں۔

.....

الوداع لندن الوداع

کالے گورے لال پیلے ہر رنگ وجنس کے انگریز دیکھے۔ اِن کی بھانت بھانت کے اقسام والی حسینائیں دیکھیں۔ جس قدر ہم نے دیکھا، کالے گورے یا گورے کالے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ تمام لوگ مل کر تفریح کرتے ہیں۔ سیر پر جاتے ہیں، ویک اینڈ پہ پارٹیاں کرتے ہیں اور ناچ کود کر، شراب کے نشے میں مست ہو کر ہلا گلا کرتے ہیں۔ دفتروں میں سر جوڑ کر کام کرتے ہیں اور ہفتے کے پانچ دنوں کے بعد ویک اینڈ کا بیتابی سے انتظار کرتے ہیں..... کیونکہ ان ''دو'' دنوں میں ان کے اندر کا مخصوص ''گورا'' باچھیں کھلا کر اور ہاہا کرتے ہوئے باہر نکل آتا ہے۔ برطانیہ میں داخل ہوتے ہی ہم نے اپنا پاسپورٹ پوشیدہ جیبوں میں چھپا کر رکھ دیا اور پہلے سانس سے لے کر آخری سانس تک ہمارا پاسپورٹ ساحل پہ دھوپ سینکتی کسی گوری حسینہ کی طرح کالی عینک پہن کر اطمینان سے اپنی جگہ لیٹا رہا۔ کسی جگہ کوئی پوچھ گچھ یا روک ٹوک نہ ہوئی غالباً اِس کی ایک بڑی وجہ تب تک اسامہ بن لادن کا پیدا نہ ہونا تھی۔ یہ نائن الیون سے پہلے کی بات ہے۔ تب تک پاکستانیوں کی آن بان اور مسلمانوں کی عزت وشان باقی تھی۔ انگریز اخلاق وکردار کے معاملے میں بہت اچھے واقع ہوئے ہیں۔ غلطی ہوئی تو فوراً اقرار کیا، سڑک پر گاڑی یا سائیکل سے کسی کو ٹکر ماردی تو آناً فاناً گتھم گتھا ہونے اور ایک دوسرے کو بھیڑیئے شیر کی طرح گھورنے کی بجائے سکون تسلی سے اپنا نقصان دیکھتے ہیں۔ نرم مزاجی سے معاملہ طے کرتے ہیں یا پھر پولیس کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ خود اعتمادی اِن کے خون میں ہیموگلوبن کی طرح پائی جاتی ہے۔ ملک کے ہر نظام کو سردست مکمل اور محفوظ نظام بنا رکھا ہے۔ عوام کا پیسہ واپس عوام کو تحفظ اور سہولیات کی شکل میں لوٹایا جاتا ہے۔ غرض کہ انہیں کپڑے پہنانے اور کلمہ پڑھانے اور انہیں پانی کی عادت ڈالنے کی کمی باقی ہے۔ یہ لوگ ویک اینڈ پر رشتہ داروں یا پڑوسیوں کے ہاں جانے کی بجائے ساحلِ سمندر، جھیلوں یا صحت افزا مقامات پر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پاکستانی و ہندوستانی مرچ مصالحوں کے اِس قدر عاشق بن چکے ہیں کہ رات گئے تک شربتِ انگور سے لطف اندوز ہو کر پاکستانی و ہندوستانی ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔ بھنے ہوئے مرغ مصالحوں سے شکم سیری کرتے ہیں اور پھر آدھی رات کو کٹی پتنگ کی طرح ڈولتے ہوئے، جھومتے جھماتے اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ بوڑھے انگریز ''پب'' میں بیٹھ کر شرابیں پیتے ہیں۔ گاؤں کے شراب خانوں اور شہر کی ''پب'' میں بے حد فرق ہے۔ گاؤں کی ''پب'' دیکھنے میں اُسی طرح ماڈرن اور بہترین تعمیر شدہ ہوتی ہے جیسے ''شہر کے شراب خانے'' ''پب'' میں مشروبات سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ کھیلنے کے لئے مختلف اقسام کی گیمز بھی ہوتی ہیں لیکن گاؤں کے شراب خانے ہمارے ہاں کی چوپالوں کی طرح ہوتے ہیں جہاں بیٹھ کر بوڑھے جوان گاؤں کے حالات پر بحث کرتے ہیں۔ نئی نئی معلومات حاصل کرتے ہیں اور زندگی کے دیگر میدانوں میں کئے گئے

یادگار تجربات کا تبادلہ کرتے ہیں۔''شراب خانوں'' میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں مار پیٹ بھی ہوتی ہے اور مسافروں، سیاحوں کو الو بھی بنایا جاتا ہے۔

سائنس میوزیم سے نکلے تو شام ہونے کو تھی۔انڈر گراؤنڈ سے ٹرین پکڑ کر ہم ٹریفلوگر سکوائر پہنچے اور پھر بانڈ اسٹریٹ اور ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف نکل آئے۔لندن دیکھتے رہے،لندن کے لوگ دیکھتے رہے، اور اِن کی حرکات دیکھتے رہے۔شام پڑ چکی تھی۔ہر طرف رنگ برنگ روشنیاں جلائی جا چکی تھیں۔ہم اِن گلیوں کی خاک و فضا میں اپنے احساسات دفن کرتے رہے۔ماضی کے سیاحوں کی خوشبو محسوس کرتے رہے۔اور پھر اپنے بدن کی باس،قدموں کے نشان اور باتوں کی گونج وہیں چھوڑ کر انڈر گراؤنڈ کے ذریعے وکٹوریہ بس اسٹیشن پہنچ گئے۔پیرس جانے والی بس میں مسافروں کا داخلہ شروع ہوا تو سامان گاڑی میں رکھوا کر ہم اطمینان سے اسٹیشن پہ آخری نظر ڈالنے کے لئے دکانوں میں گھومنے لگے۔عین روانگی کے وقت بس کے پاس پہنچے، پیچھے مڑ کر لوگوں اور چمکتی دوکانوں پہ ایک بھرپور نظر ڈالی اور بس میں داخل ہونے کیلئے زینوں پہ قدم رکھ دیا۔''الوداع لندن الوداع''.....

.....

کون؟.....ہم!.....کدھر؟.....پیرس!.....کب؟.....ابھی!

بس وکٹوریہ اسٹیشن سے رات گیارہ بجے روانہ ہوئی اور کچھوے کی رفتار چلتی ہوئی لندن شہر کی سڑکوں پر چکر لگانے لگی۔ہم صبح سے لندن کی سڑکوں،گلیوں اور میوزیمز میں بے آرام گھوم رہے تھے،اب ذرا سکون حاصل ہوا تو تھکاوٹ نے رنگ دکھایا اور نیند نے دل ودماغ پر غلبہ پانا شروع کر دیا۔دل میں پکا ارادہ باندھ لیا کہ کسی بھی قیمت پہ آنکھ نہیں لگنی چاہئے کیونکہ روز روز اِس دیس میں آنہیں سکتے اور ایسے دلفریب حسین سلسلوں پر مشتمل سفروں کے مواقع بھی زندگی میں کبھی کبھار حاصل ہوتے ہیں۔ بہت سر جھٹکا،بس کے اندر بنے ہوئے ٹوائلٹ سے منہ دھویا،بمشکل آنکھیں کھول کر گالوں پہ دو چار مرتبہ چپت رسید کی لیکن آخر کار نیند یہ معرکہ جیت گئی اور ہم نے مایوس ہو کر تھکے ہارے سپاہی کی طرح اپنا کاہل وجود نیند کے سپرد کر دیا۔ساتھ والی سیٹ پر ''سوزینا'' براجمان تھی جو فی الوقت کانوں میں ہیڈ فون لگائے کسی انگریزی گیت پر سر دھننے میں مصروف تھی۔کسی بھی مرحلے پر ہماری آنکھ کھلتی تو وہ سر ہلا کر ہلکی سی معصوم مسکراہٹ سے نواز دیتی۔گاڑی جب ڈوور کی بندرگاہ پر پہنچی تو اعلان ہوا کہ تمام مسافر گاڑی سے اتر کر فیری میں چلے جائیں۔چنانچہ خود کو بمشکل بیدار کر کے ہم اپنا سامان جوں کا توں چھوڑ کر بس سے نیچے اتر آئے جہاں چند انگریز اہلکار پاسپورٹ چیک کرنے کے لئے مسافروں کی راہ تک رہے تھے۔اوباسیاں لیتے ہوئے ہم نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں اپنا پاسپورٹ چیکنگ افسر کو تھما دیا۔اِس بے ادبی کا اُس گورے نے کتنا برا منایا یہ مشاہدہ کرنے کے لئے ہماری آنکھیں کھلی ہونا لازمی جزو تھا جو کہ اُس وقت ایک ناممکن مرحلہ تھا۔پاسپورٹ چیک کروانے کے بعد تمام مسافر فیری میں داخل ہوئے۔ہماری بس کی طرح دوسری گاڑیاں اور بسیں بھی فیری میں لوڈ ہونے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔رات کا گھپ اندھیرا دور کرنے کے لئے بندرگاہ اور فیری پر روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔''ڈوور'' کی بندرگاہ سے فرانس کی بندرگاہ ''کلائس'' تک لگ بھگ ایک گھنٹے کا فاصلہ تھا۔اپنے مخصوص انداز میں بھونپو بجا کر فیری کی روانگی کا اعلان کیا گیا اور اسٹیمر ہولے ہولے سمندر کے سینے پر ڈولنے لگا۔فیری کے ٹی وی لاؤنج سمیت ہر کمرے،انتظار گاہ،شراب خانوں حتیٰ کہ انڈور گیمز کے حصوں میں پڑی کرسیوں اور بنچوں پر بھی نیند میں ڈوبی ہوئی گوری کالی مخلوق نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔چند مجبور و بے کس مسافر فرش پر کپڑا بچھا کر بھی محوِ استراحت ومحوِ راز و نیاز نظر آ رہے تھے۔فیری کے ذریعے سفر کا چونکہ ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا اِس لئے ہم عادت سے مجبور ہو کر فیری میں ہی آوارہ گردی کرنے لگے۔نیند اب آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔جہاں آوارہ گردی کرنے کے لئے نئی زمین میسر آ جائے وہاں ہم جیسے جہاں گرد سیاحوں کی نیند چین سکون اور بھوک ہر چیز عنقا ہو جاتی ہے۔فیری کی ایک منزل پر شاپنگ کے لئے مختلف اسٹال

اور ڈیوٹی فری شاپس بنی ہوئی تھیں۔اوپر والی منزل پر انٹرٹینمنٹ اور انڈور گیمز سیکشن تھا جہاں ویڈیو گیمز کا بے ہنگم شور ماحول میں بدمزگی پیدا کر رہا تھا۔کہیں نزدیک سے بلند ہوتے چند ملے جلے نسوانی اور مردانہ قہقہے ماحول میں زندگی کی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ جا بجا کرنسی تبدیل کرنے والی اور جوا کھیلنے والی مشینیں لگی ہوئی تھیں ۔تھکے ہارے اور نیند کے مارے مسافروں میں ایک ہم ایسے مسافر تھے جو اِس وقت گھر کا رستہ بھولے ہوئے بچے کی طرح ہر جگہ گھس گھس کر معائنہ کرنے میں مصروف تھے۔ٹی وی لاؤنج میں ایک طرف پڑی ہوئی تین کرسیوں پر ''سوزینا'' قبضہ جمائے ایک خوبصورت کمبل اوڑھے میوزک سنتے سنتے دہری ہوکر سوگئی تھی۔غرض کہ فیری پر مختلف انواع و اقسام کے سیاحوں،مسافروں، تاجروں اور رومانوی جوڑوں پر مشتمل ایک ننھی سی خوابگاہ،ایک عارضی دنیا آباد تھی۔ جہاں شراب کے جام کھنکنے کی آوازیں بھی آتی تھیں اور ہمارے سامنے میز پر رکھی ہوئی گرم گرم کافی کے کپ سے اٹھتی ہوئی بھاپ بھی دکھائی دے رہی تھی۔

میں مستنصر نہیں ہوں

(سفرنامے کا یہ حصہ خاص کر اُن دوستوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا جنہوں نے ''مستنصر حسین تارڑ'' کا ناول ''پیار کا پہلا شہر'' پڑھ رکھا ہے۔ایک خاص تبدیلی جو سفرنامے کے اِس حصے میں کی گئی ہے وہ صیغہ جمع کی جگہ صیغہ واحد کا استعمال ہے جس میں نہ صرف ایک عظیم قلمکار کے سامنے عاجزی کا پہلو نمایاں ہے بلکہ صیغہ واحد کے استعمال سے سفرنامے کے اِس مضمون کا حسن بھی دوبالا ہوگیا ہے۔)

فیری میں ہر جگہ سوئے ہوئے مسافروں کے درمیان کوئی جگہ نہ پا کر میں اسٹیمر کے عرشے پر چلا آیا۔سمندر کی نمکین ٹھنڈی ہوا بدن سے ٹکرائی تو جسم کے اندر تک سرد سوئیاں چبھتی چلی گئیں۔فضا میں سمندر کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔میں جیکٹ بند کئے، کالروں میں کان دبائے اور بغلوں میں ہاتھ ٹھونسے سامنے بچھے ہوئے بنچ پر جا بیٹھا۔عرشے پر اس وقت اکا دکا افراد نظر آ رہے تھے۔ دور کہیں روشنی کے چند ننھے منھے جھلملاتے ہوئے نقطے.....

فیری کو چلے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ڈوور کی سرزمین پر اگے ہوئے پتھروں کے سفید پہاڑ ننھی منھی روشنیوں کے بیچ مہیب سائے لگ رہے تھے۔ایک پہاڑ کی چوٹی پہ مدھم سا جلتا ہوا بلب۔۔۔شاید۔۔۔میں۔۔۔

لیکن نہیں۔۔۔میں تو اسٹیمر پر تھا۔۔شاید کوئی پجاری کسی پہاڑی دیوی کے

چرنوں میں چراغ روشن کئے ہوے تھا۔۔لیکن روشنی کی کیا ضرورت اور یہ سب تو افسانوی باتیں ہیں۔۔۔لب تو اندھیرے میں بھی مل سکتے ہیں۔۔اور چاند بھی تو رات کے اندھیرے میں بے چین و بے قرار کسمساتے ہوئے جسموں کے دلوں میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔۔۔پھر ایک بلب کی کیا ضرورت۔۔۔یہ سب تو افسانوی باتیں ہیں۔

اچانک میرے ساتھ والے بنچ پر کوئی چیز ہلی۔۔۔میرے دل کی ایک نامکمل دھڑکن زور سے دھڑکی۔۔دل تھام کر میں اس بینچ کی طرف گیا مگر کچھ نہ پا کر مایوس لوٹ آیا۔

بنچ پہ فارغ لیٹے لیٹے میں غیر ارادی طور پر ستارے دیکھنے لگا۔انسان اپنی سوچوں میں ہر سرحد، باؤنڈری اور ہر قید سے آزاد ہوتا ہے۔مجھے ستاروں کا ایک فیصد بھی علم نہیں، نہ ہی میں نے قدیم زمانے کے کسی ماہر ملاح کی داستانِ سفر پڑھی کہ مجھے ستاروں کی پہچان ہوتی۔سردی کا احساس بڑھنے لگا تو میں اپنے آپ میں دبک گیا۔ستاروں میں اپنا ایک ستارہ ڈھونڈنے میں محو تھا کہ ایک مرتبہ پھر ساتھ والے بنچ پر کسی چیز کے ہلنے کا احساس

ہوا۔میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ،خوف سے دھک دھک کرتی دھڑکنوں کے ساتھ چاروں طرف دیکھتے ہوئے میں نے تھوک ایک گھونٹ بمشکل حلق سے نیچے اتارا۔ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ساتھ والے بینچ کی طرف دیکھا تو ادھر کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور زوردار قہقہہ مار کر ہنس پڑا..... پیٹ پکڑ کر گہرا سانس لیا..... گیئر بدلا..... زور سے ہنسا اور پھر بے اختیار ہنستا چلا گیا..... آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے..... ہنستے ہنسے رو پڑا..... پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا..... سمندر کی نرم ملائم چکنی مچھلیوں کی پرسکون نیند میں شدید خلل پڑا..... اسٹیمر سمندر کی غضبناک موجوں کے زور سے ڈولنے لگا۔ میں اٹھ کر اُس شرارتی بینچ کی طرف گیا..... اُس کے گرد طواف کرنے لگا..... پھر میں نے اُس کے انگ انگ پر ہاتھ پھیرا اور زور سے ہنس پڑا.....

وہ..... وہ شاید پاسکل تھی.....

ہاں..... مستنصر حسین تارڑ کی پاسکل..... مگر میں مستنصر نہیں ہوں..... مستنصر کا ہموطن اور اُس کی طرح کا ایک آوارہ گرد خودساختہ بدتہذیب سیاح ہوں۔ مجھے ایفل ٹاور پر وقت گزارنے کا شوق ہے مگر میں مستنصر نہیں ہوں..... مجھے پاسکل نہیں مل سکتی..... اور مجھے تو کیتھرین ملی تھی.....

ہاں! برمنگھم کے ایک کیفے میں بیٹھی ہوئی کافی کے گھونٹ لیتی کیتھرین..... اپنے خوابوں کے شہزادے کے لئے ننھے منھے خواب سجوتی کیتھرین..... جسے میں ہی نہیں سب پیار سے کیتھی کہتے تھے..... جس کا ذکر میں جان بوجھ کر اِس سفرنامے سے گول کر گیا..... اس نے مجھے ایک انگریزی نظم بھی سنائی تھی.....

'' اور جب میں اداس تھی
بہار کی سہانی راتوں میں تنہا جاگتی تھی
چاند سے باتیں کرنے کے لئے
میرے پاس الفاظ نہ تھے
شبنم سے بھیگی کلیاں دیکھنے کے لئے
میں بے تاب ہو جایا کرتی تھی
میں کسی کا ہاتھ تھامنے کو بے قرار تھی
اور پھر ایک شام
وہ کالی آنکھوں والا اجنبی
جس کا گندمی رنگ سونے کی طرح چمک رہا تھا
جس کے لمس نے
میرے جسم میں پارہ بھر دیا تھا
وہ مجھے ملا اور پھر

میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ کہیں
یہ وہی گندمی رنگ کا شہزادہ تو نہیں
جس کا مجھے انتظار تھا

''خوبصورت.....بہت خوبصورت''

وہ'' کیتھی ''کسی گندمی رنگ والے پاکستانی کی محبت میں بری طرح گرفتار تھی.....مگر وہ ایک ٹانگ سے لنگڑی تو نہ تھی.....وہ ایک مکمل لڑکی تھی جو خود کو نامکمل کہتی تھی.....لیکن مجھے پاسکل چاہیئے.....جس کے لئے میں ایک بیساکھی بن جاؤں.....جسکے ساتھ میری ہر شام دریائے سین کے کنارے گزرے.....جسکے ساتھ میں شانزا لیزے کی طلسم بھری روشنیاں دیکھنے جاؤں.....جس کی رہنمائی میں جنگل کی تنہائیوں میں رقص کروں۔مستنصر تو شیو بناتا تھا.....اس ننھی سی جان کو سڑک کنارے انتظار کرواتا تھا اور مستنصر تو سرائے کی بوڑھی مالکن کے ساتھ عشق کے پیچ لڑاتا تھا۔میں کوئی دیر نہیں کرونگا.....میں کسی کے ہاں اپنے ہاتھ کی دی ہوئی پتی کی چائے بھی نہیں پیوں گا۔اپنی سرائے کی مالکن سے پینگیں بھی نہیں بڑھاؤں گا اور میں جنگلوں کی تنہائی میں جلدی رقص سیکھ جاؤں گا.....لیکن میں مستنصر نہیں ہوں.....مجھے پاسکل نہیں مل سکتی.....میں مستنصر نہیں ہوں.....سوچوں میں ڈوبے ہوئے،قہقہے لگاتے تھکن سے چور ہو کر آنکھوں سے پانی پونچھتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک پاکستانی نوجوان زینے چڑھ کر عرشے پر آ رہا تھا۔میں نے حالت درست کی اور اپنے بینچ پر جا بیٹھا۔

وہ نوجوان میرے پاس آیا اور پوچھا.....پاکستانی؟.....

ہوں.....میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا.....

وہ پھر سے بولا.....میں نیچے سو رہا تھا کہ میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا.....میں نے دیکھا کہ عرشے پر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی کھڑی ہے جس کے گرد سنہری سفید ہیولے رقص کر رہے ہیں۔وہ مجھے اوپر بلا رہی تھی اس لئے میں عرشے پر چلا آیا۔اس کی بات ابھی مکمل ہوئی ہی تھی کہ میں اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنس پڑا.....

ایک اور بلند قہقہہ.....

میں نے بمشکل اپنے قہقہوں کو روکتے ہوئے پوچھا.....کیا تم نے مستنصر کی پاسکل کے بارے میں پڑھا ہوا ہے؟

ہاں!پڑھا تو ہے وہ سراسیمگی کی حالت میں بولا.....

پھر تمہارا قصور نہیں ہے.....یہ کہتے ہوئے میرے حلق سے پھر ایک واشگاف قہقہہ بلند ہوا.....پھر تمہارا قصور نہیں ہے.....میں پیٹ پکڑے دہرا ہوتے ہوئے عرشے کے کنارے آ لگا اور بڑبڑانے لگا.....تمہارا قصور

نہیں ہے.....اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔

اچانک سامنے لال پیلی روشنیاں نظر آنے لگیں۔شاید نپولین کی سرزمین آنے والی تھی۔میں عرشے سے نیچے جانے کے لئے مڑا تو بنچ پر ایک مرتبہ پھر کسی حرکت کا گمان ہوا۔ایک سرد مسکراہٹ کے ساتھ میں نے خود کو سمجھایا کہ میں مستنصر نہیں ہوں.....اور پھر بغیر کسی کو سہارا دیئے بڑبڑاتے ہوائے میں نے عرشے سے نیچے جانے والی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے.....

.....

ہیلو!.....پیرس!

فیری کے تمام خوابیدہ و نیم خوابیدہ مسافر جاگ کر اپنا اپنا سامان سمیٹنے میں مصروف تھے۔ فیری آہستہ آہستہ ''کلائس'' کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے لگی۔ تمام مسافروں کے لئے اپنی اپنی بسوں پر پہنچ جانے کا علان ہو چکا تھا۔ اپنی بس میں پہنچ کر ہم شیشے سے باہر کے حالات دیکھنے میں مصروف تھے کہ کسی نے بڑی شائستگی سے کندھے کو تھپتھپایا.....

وہ ''سوزینا'' تھی۔

اس پر ابھی تک نیند کا غلبہ طاری تھا۔ وہ بس میں پہنچنے کے بعد بھی آنکھیں

بند کر کے سیٹ پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ وہ جاگ کر اپنا پاسپورٹ چیک کروانے کے بعد مجھے آنکھوں کے اشارے سے دائیں طرف کھڑے فرانسیسی اہلکار کی طرف اشارہ کرنے لگی اور پھر آنکھیں بند کر کے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

پاسپورٹ پلیز.....فرانسیسی اہلکار نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پاسپورٹ مانگا.....اس کی نظریں سوزینا پر گڑھی ہوئی تھیں.....نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نے اسے ایک عدد مسکراہٹ سے نوازا اور اپنا پاسپوٹ اُس کے حوالے کر دیا۔ سبز پاسپورٹ پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے کے تاثرات یکدم سنگین صورت اختیار کر گئے۔ اُس نے پہلے پاسپورٹ پر لگی تصویر دیکھی اور پھر ہمارے چہرے کا معائنہ کرنے لگا۔ اُس نے یہ عمل تین چار مرتبہ دہرالیا تو ہمیں تشویش ہونے لگ گئی کہ یا خدا ایک ہی رات میں ایسی بھولی بھالی معصوم صورت پر کونسی مشکوک تبدیلی آ چکی ہے جو موصوف ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ لاشعوری طور پر ہم نے ندیدے بنتے ہوئے دوسری طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ

دراصل نیند میں ڈوبی ہوئی ''سوزینا'' کو دیکھ رہا تھا اور شاید یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ ''حور کی بغل میں لنگور کیسے آن پہنچا''۔ بے شک اُس کا سوچنا درست تھا۔ پاسپورٹ چیک کرنے اور پہلے کی طرح دو چار منٹ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد بادلِ نخواستہ وہ آگے بڑھ گیا۔ گاڑی بندرگاہ سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تو کسی وجہ سے سوزینا کی آنکھ کھل گئی۔ کافی جتن کرنے کے بعد بھی آنکھ نہ لگی تو اُس نے ہم سے بات چیت شروع کر دی۔ اُس کے مطابق پیرس ابھی پانچ سے چھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ اس کی زیادہ تر باتوں کا مرکز اُس کا فرانسیسی محبوب ''جیک'' تھا۔ بس تیزی سے منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ کر شیشے سے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تو ہر طرف کھیت کھلیان اور کھلے میدان نظر آئے۔ ''کلائس'' سے پیرس تک کے راستے میں کون کونسے شہر اور مقامات آئے بالکل یاد نہیں کیونکہ بس ماسوائے چند سروس

اسٹیشن اور ریستورانوں کے کہیں نہیں رکی تھی۔ باہر کے نظارے کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے نیند کا لطف بھی حاصل کیا۔ باتھ روم کا

فلش بھر جانے کے باعث بس میں ہلکی پھلکی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی جسے بس کے عملے نے خوشبو چھڑک کر رفع کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ کسی وقت آنکھ کھلی تو دیکھا کہ باہر صبح کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ چوبیس گھنٹوں پر مشتمل پورے ایک دن کے سب سے حسین ترین لمحات صبح کاذب اور صبح صادق کے نظارے ہوتے ہیں۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جیسے انڈہ توڑ کر کوئی ننھا منھا نرم ملائم صاف ستھرا چوزہ باہر کی دنیا میں آتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے نرم ملائم پروں کا رنگ انتہائی خوبصورت یعنی پیلا ہو جاتا ہے ۔یعنی رات کے بطن سے نکلنے والے خوشنما دن کے شروعات کے یہ لمحات اپنے اندر تمام تر معصومیت، چاشنی اور طمانیت لئے ہوتے ہیں۔شیشے سے باہر صبح کی تر و تازگی ہم اپنے بدن میں محسوس کر رہے تھے۔دل چاہ رہا تھا کہ سرسبز لہلاتے کھیتوں اور انگوروں کی سینکڑوں بیلوں والے باغات میں چہل قدمی کی جائے اور رقصِ صبا کا بھرپور ساتھ دیا جائے۔دل میں آیا کہ ٹھنڈی ٹھنڈی سڑک پر ننگے پاؤں دور تک چلا جائے اور صبح سویرے کھیتوں پہ جانے والے لوگوں سے ہنسی مذاق کیا جائے اور اُن کے علاقائی گیت سنے جائیں۔دل کر رہا تھا کہ بجلی سے چلنے والے بہت چھوٹے چھوٹے فصلوں کو سیراب کرتے فواروں کی پھوار میں کھڑے ہو کر خوامخواہ بھیگا جائے اور ہلکی ہلکی سردی سے ٹھٹھرا جائے۔جی چاہ رہا تھا کہ راستے میں آنے والے چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کے کنارے بیٹھ کر ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈبو دیئے جائیں اور خنک ہوا کا مزہ لیا جائے۔رنگ برنگ پرندوں کی مترنم چہچہاہٹ اور سریلے گیت سننے کو دل کر رہا تھا۔گدلے گدلے آسمان سے تھکی ہوئی بیزار آنکھوں میں ٹھنڈک اتار لینے کو دل کر رہا تھا اور الوداع کہتے ہوئے چاند ستاروں کو خدا حافظ کہنے کو من کر رہا تھا۔بلاشبہ یہ بہت ہی خوبصورت صبح تھی جس کا لطف ہم بس کے اندر بیٹھے بیٹھے اٹھا رہے تھے۔بس کے ٹھنڈے شیشے کے ساتھ ہم نے اپنا چہرہ جما دیا۔راستے میں آنے والے سائن بورڈز پر نظر پڑتی تو پتہ چلتا رہتا کہ پیرس کتنا دور رہ گیا ہے۔منزل اب دور نہیں تھی۔

ہیلو.....''سوزینا'' کی گنگناتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی.....

پیرس آنے والا ہے.....وہ قدرے خوش ہوتے ہوئے بولی.....میں تمہیں

جیک سے ملواؤں گی.....تمہیں کون لینے آرہا ہے؟.....

ہم نے ہنس کر جواب دیا.....کوئی نہیں.....

وہ آفر کرنے لگی کہ اگر ہم اُس کے ساتھ چلیں تو وہ لوگ ہمیں ہمارے مطلوبہ مقام پر پہنچا سکتے ہیں مگر ہم نے یہ سوچ کر کہ کباب میں ہڈی بننا بری بات ہوتی ہے اِس سودمند آفر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم اپنی ذات کے بل بوتے پر خوبصورت رازوں والے اس شہر کو عیاں کرنا چاہتے ہیں۔گاڑی پیرس کے نواحات میں داخل ہوئی تو لوگوں نے اترنے کی تیاریاں پکڑنی

شروع کر دیں۔سنسان ویران سوتے ہوئے شہر میں چکر کاٹنے کے بعد بس ''گیلینی'' نام کے بس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔مسافر بے تاب ہو کر بس سے نیچے اترنے لگے۔سوزینا نے اپنے بوائے فرینڈ سے ملوایا۔وہ کافی خوش اخلاق اور خوش شکل لڑکا تھا۔سوزینا کا انتخاب پسند آیا تھا ہم نے دل ہی دل میں پاسپورٹ چیک کرنے والے فرانسیسی اہلکار کی سوچ پر سو فیصد اتفاق کر لیا ''جیک واقعی لنگور سے کچھ اور ہم سے سے کچھ زیادہ ہی بہتر تھا''۔

.....

اُف یہ خطائیں..... یہ سزائیں

اپنا سامان لے کر ان دونوں محبت کے ستاروں کو الوداع کہتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔سب سے پہلا مرحلہ واش روم ڈھونڈنے کا تھا۔ایک جگہ واش روم مل گیا لیکن ہمارے لئے یہ ایک معمہ ثابت ہوا کیونکہ ہم باہر کھڑے دیر تک باتھ روم خالی ہونے کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی دروازہ نہ کھلا۔جھنجھلا کر ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے تو پتہ چلا کہ باتھ روم کے دروازے میں دو فرانک کا سکہ ڈالنا پڑتا ہے۔تو دروازہ کھلتا ہے اتنے میں ایک پاکستانی شخص اندر آیا اور سکے ڈال کر باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ایمرجنسی کی حالت میں فرانک حاصل کرنا آسان کام نہ تھا سو ہمیں ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔پاکستانی شخص جب باہر نکلا تو ہم نے اُسے دروازہ بند نہ کرنے کی درخواست کی اور اُسی کھلے دروازے سے باتھ روم میں گھس کر کنڈی چڑھا دی۔فرانسیسیوں کو صبح صبح دو فرانک کا نقصان پہنچانے کے بعد بڑے ہشاش بشاش ہو کر کرنسی تبدیل کروانے والے کاؤنٹر پر پہنچے اور ڈالر دے کر فرانک حاصل کئے۔اِس کے بعد ٹورسٹ گائیڈ کاؤنٹر کی طرف جانا تھا جہاں لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔انتظار کے بعد جب باری آئی تو انکشاف ہوا کہ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص انگریزی جب کہ ہم فرانسیسی سے پیدل ہیں۔کاؤنٹر پر بیٹھے شخص پر شک تو تھا کہ وہ بوجوہ انگریزی بولنے سے گریزاں ہے لیکن بحث بیکار تھی۔اشاروں کنایوں میں اپنا مدعا بیان کر کے پیرس کا نقشہ اور دیگر پمفلٹ حاصل کئے۔اگلا مرحلہ اب طارق اعظم صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کرنا تھا جس کی خبر ان کو پہلے ہی دے دی گئی تھی کہ ہم عنقریب فرانس پہنچنے والے ہیں۔ہمارے چلنے سے پہلے مانچسٹر سے شاہد بھائی نے ان کو فون کر کے ہمارے بارے میں بتا دیا تھا۔فون کرنے کے لئے ایک فون بوتھ ڈھونڈا۔فون بوتھ کارڈ سسٹم تھا۔سکوں کے ذریعے فون کرنے کی سہولت موجود نہ تھی۔برطانیہ میں ایک ہی فون بوتھ کے ذریعے سکوں اور کارڈ سے فون کرنے کی سہولت موجود ہوتی ہے۔زبان کے اختلاف کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور (بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ شعوری طور) پر فرانسیسیوں نے اپنے نظام زندگی میں بھی انگریزوں کی بھرپور نفی کی ہے۔تلاش بسیار کے بعد بھی جب کہیں سے سکہ سسٹم فون بوتھ نہ ملا تو ایک دکان سے فون کارڈ خرید لیا۔فون بوتھ قریب تھا اِس لئے اسی دکاندار سے فون ملانے کی درخواست کی اور مستقبل کے لئے اُس سے فون ملانے کا طریقے کاغذ پر لکھوا لیا کیونکہ کارڈ پر لکھی فرانسیسی سے ہم بالکل نابلد تھے۔چینی قوم کی طرح فرانسیسی انگلش زبان سے نجانے کیسا بیر رکھتے ہیں کہ ٹریفک اشاروں،اسٹریٹ روڈز،سائین بورڈز اور کئی مقامات پر انگلش کا نام ونشان بہت کم ملتا ہے۔طارق صاحب سے رابطہ ہوا تو انہوں نے ہمارے بخیر و عافیت پہنچ جانے پر خدا سے اظہارِ تشکر کیا۔ہم نے انہیں صحیح سلامت پہنچ جانے کی نوید سنائی اور دیگر حالاتِ سفر سے آگاہ کیا۔طارق صاحب کسی ضروری کام کی وجہ سے اسٹیشن پر نہ آ سکے تھے اِس لئے ہمیں راستوں کے بارے

میں بتانے لگے۔انہوں نے بتایا کہ ہم اگر انڈر گراؤنڈ کا پاس بنوالیں تو نہایت مفید رہے گا۔اب ہمیں انڈر گراؤنڈ کا پاس بنوانے کے لئے ٹکٹ کاؤنٹر کی تلاش تھی۔کھوج لگانے کے بعد ریلوے اسٹیشن سے پاس بنوایا جو ہمیں پاکستانی پینتیس سو روپے میں پڑا۔ادارہ منہاج القران کا ایڈریس فرنچ زبان میں ایک کاغذ پر لکھ رکھا تھا۔جس کے بل بوتے پر ہمیں اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔ہر دو منٹ کے بعد ہم طارق صاحب کو فون کر کے زحمت دینے کے حق میں نہیں تھے۔اُس کاغذ پر انگلش اور فرنچ دونوں زبانوں میں پورا نام ادارہ منہاج القران لکھنے کی بجائے محض ''آئی ایم کیو'' لکھ رکھا تھا۔اپنی جلد بازی اور بے دھیانی کی عادت کے باعث ہم یہ نتیجہ اخذ نہ کر سکے کہ دراصل ''آئی ایم کیو'' ادارہ منہاج القرآن کی ہی نمائندگی کرتا ہے۔اِسی وجہ سے ہم ہر جگہ ''آئی ایم کیو بلڈنگ'' کہتے رہے اور ہمیں اپنی منزل ڈھونڈنے میں بے حد دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ٹرین پکڑ کر اپنے مطلوبہ اسٹیشن پہنچے اور ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔راہ چلتے لوگوں کو ایڈریس والا کاغذ دکھا کر رستہ پوچھنے لگے لیکن کوئی ایک فرد بھی اس نام کی کسی بلڈنگ سے واقف نہ تھا۔ایک جگہ سڑک پر کھڑی ایک ویگن میں انڈوں کے کریٹ رکھتے ہوئے ایک فرانسیسی کو جب ہم نے انگلش میں مخاطب کرنا چاہا تو اُس نے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا.....ثابت ہوا کہ یہ واضح طور پر انگلش زبان کی مہربانی ہے۔یہ علاقہ خالی خالی اور سنسان سا لگ رہا تھا۔شہر کے ایک حصے میں یہ بے حد پرسکون علاقہ تھا۔دکانیں برائے نام نظر آ رہی تھیں۔گیارہ بجنے کو تھے مگر سورج کی کرنیں ابھی تک زمین تک پہنچنے سے جھجھک رہی تھیں۔بھوک سے برا حال تھا اور پیٹ قل ھواللہ کا ورد کرنے میں مصروف تھا۔ایک جگہ کوئی بیکری نظر آئی تو وہاں سے ایک لمبی سی روٹی خرید لی جسے ہم نے بیکری کے سامنے لگے ہوئے درختوں کے نیچے بچھے ہوئے بنچوں پر بیٹھ کر بڑے مزے لے لے کر کھایا۔سامنے ریل کی پٹڑی تھی۔اور پٹڑی کے ساتھ ساتھ اونچی عمارتیں اور فلیٹ تھے۔زرد پتے آہستہ آہستہ درختوں سے جھڑ کر فٹ پاتھ اور پٹڑیوں پر گر رہے تھے.....وہ منظر ایسا دلفریب اور دل کو چھو لینا والا تھا کہ اپنے تمام سفر کے دوران اور سفر سے واپسی پر بھی وہ موقع ہم نے خاص طور پر یاد رکھا۔اُسی منظر کو یاد کر کے دل اب بار بار سیاحت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔جانے در در کی خاک چھاننے میں سیاح کی ایسی کونسی تشنگی پوری ہوتی ہے کہ وہ ایک بار پھر سے سامان کمر پر لادے انجان راستوں میں بھٹکنے کے لئے چل پڑتا ہے۔بھوک کا تو فی الفور علاج ہو چکا تھا مگر ہماری تلاش ابھی تک جاری و ساری تھی۔ایک سڑک سے گزرتے ہوئے کسی گھر میں چند مزدور کام کرتے ہوئے نظر آئے۔ہم اندر پہنچے تو وہ اپنے ہم وطن نکلے جو دیواروں پر سفیدی کرنے میں مصروف تھے۔ہموطنوں کو ایسے مشکل وقت سامنے دیکھ کر جہاں دل نہایت شاد ہوا.....وہیں بے وطنی کی حالت میں انہیں پائی پائی کے لئے محنت مشقت کرتا دیکھ کر دل ناشاد بھی ہو گیا۔دعا سلام کے بعد ہم نے اپنی مشکل بیان کی۔جو شخص ہم سے بات کر رہا تھا وہ گجرات کے کسی قصبے سے تعلق رکھتا تھا۔اُس نے چند فرانسیسیوں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد ہمیں ایک بس کے بارے میں بتایا کہ اس بس کے ذریعے ہم راستے میں آنے والے

مکڈونلڈ والے سٹاپ پر اتر جائیں۔ کیونکہ یہ ایڈریس اُس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور بس اسٹاپ سے بس پکڑی۔ انڈر گراؤنڈ کا جو پاس ہم صبح بنوا چکے تھے وہ بسوں کے لئے بھی ٹکٹ کا کام دیتا تھا اور بسوں میں بھی کارآمد تھا۔ مکڈونلڈ کی تلاش میں تمام راستے نظریں دوڑاتے رہے تو ایک جگہ ہمیں بائیں طرف میکڈونلڈ کی عمارت نظر آئی۔ اسی اسٹاپ پر اتر کر ہم نے سکون کا سانس لیا۔ الو کی طرح دیدے گھماتے ہم بتائی گئی سڑک پر چلنے لگے تو سامنے خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی والا ایک جواں سالہ پاکستانی نظر آیا۔ دل میں آیا کہ ہو نہ ہو یہی طارق اعظم ہیں۔ تعارف ہوا تو ہمارا شک بجا نکلا.....وہ طارق ہی تھے.....منہاج القرآن کے اِس مرکز کے کرتا دھرتا جو کافی دیر سے کھڑے ہماری راہ تک رہے تھے.....ہم ان کی رہنمائی میں پیدل ہی رستے پر چل دیئے۔ ہم نے انہیں ایڈریس والا کاغذ دکھاتے ہوئے اپنے بھٹکنے کا دکھڑا سنایا اور پوچھا کہ اِس لفظ ''آئی ایم کیو بلڈنگ'' کا کیا مطلب ہے تو وہ محوِ مسکراہٹ نظر آنے لگے اور بولے کہ انگلش کے یہ الفاظ دراصل ادارہ منہاج القرآن بلڈنگ کے مخفف ہیں تو ہم پر اچانک یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ہم نہایت بے وقوف اور بدھو واقع ہوئے ہیں۔ اپنے بارے میں اِس قدر بیش قیمت معلومات اور حقائق جان کر دلی خوشی ہوئی۔ اعظم صاحب شادی شدہ اور ماشاءاللہ بال بچے دار آدمی تھے۔ پانچ منٹ سفر طے کر کے ہم وسیع احاطے میں تعمیر شدہ ایک بلڈنگ کے قریب

پہنچے۔ یہی ''آئی ایم کیو بلڈنگ'' تھی۔ اوپر والی منزل پر اعظم صاحب بمع اہل وعیال رہائش پذیر تھے جب کہ نیچے والی منزل کو ادارے کی سرگرمیوں کیے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اندر پہنچ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ ایک کمرے میں اپنا سامان رکھا۔ تازہ دم ہونے کے بعد بہترین کھانا کھایا اور طارق بھائی سے پیرس کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کرنے لگے۔ پیرس میں ہمارا قیام صرف چار دن کا تھا۔ چوتھے دن واپس لندن کی بس پکڑنی تھی کیونکہ ہم نے پاکستان کا ریٹرن ٹکٹ کروا رکھا تھا۔ اور پاکستان میں اشد ضروری کاموں کی وجہ سے مقررہ وقت پر واپس پہنچنا لازمی تھا۔ ایسے سحر انگیز شہر کے لئے دو دن مخصوص کرنا اِس شہر کے ساتھ زیادتی تھی۔ طارق صاحب نے بتایا کہ ہم رات کے دس بجے تک گھوم پھر کر یہیں اِسی جگہ آ جائیں تو ہمارے میزبان کا انتظام کر دیا جائیگا۔ دس بجے کے بعد انہیں کسی دوسری جگہ کام سے جانا تھا۔ ہمیں یہ بات وہیں معلوم ہوئی کہ ادارے سے وابستہ صاحبِ حیثیت افراد کھلے دل سے ادارے کے مہمانوں کے لئے میزبان کے فرائض انجام

دیتے ہیں اور کسی بھی نئے مہمان کی آمد پر کوئی نہ کوئی رکن رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات، اپنا گھر اور دیگر سہولیات پیش کر دیتا ہے۔ وطن دوستی کی اِس سے بڑی مثال وطن سے باہر اور کیا ہو گی۔ تھوڑی دیر بعد اُن سے اجازت لے کر ہم آوارہ گردی پر نکلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ طارق اعظم صاحب ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ کمر کستے ہوئے ہم نے شہر کی راہ لی اور یہیں ہم سے انجانے میں ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی جس کا خمیازہ ہمیں بعد میں بھگتنا پڑ گیا۔

روٹھا ہوا پیرس

پیرس میں کوئی بھی سیاح پہلی مرتبہ آتا ہے تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ پہلی ہی فرصت میں ایفل ٹاور دیکھے۔سو ہمیشہ سے دل میں مچلتی ہوئی خواہشوں میں سے ایک بڑا حصہ ایفل ٹاور کے لئے بھی مخصوص تھا۔آج ہم ایفل ٹاور کی سرزمین پر تھے۔شوق کی تکمیل ہونے جارہی تھی اور ہم اپنی خواہشات کو حقیقت کا لباس پہنانے کے لئے نہایت بے تاب تھے۔ایفل ٹاور ہر سیاح کے دل میں بستا ہے۔خوبصورت انسانوں کی طرح خوبصورت مقامات کو بھی یہ ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ دنیا کے سامنے جھک جھک کر اپنا حسن عیاں کریں یا زمانے کے سامنے اپنی رعنائیوں کا پیرہن اتار کر بے ہنگم رقص کریں بلکہ جو مقام اپنے اندر خاصیت رکھتا ہے زمانہ اسے خود پہچان لیتا ہے۔جو مقام کسی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے یا جس میں حسن کی ذرا سی بھی شبیہہ ہوتی ہے وہ اپنے معیار کا فیصلہ دل اور دنیا والوں کی نظر پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کے حسن،مقبولیت اور خاصیت کا معیار زمانہ ضرور مخصوص کرتا ہے۔لہٰذا جسے آغاز میں بے مصرف اور بے ڈھنگا لوہے کا کھمبا تصور کیا جاتا تھا آج پیرس کی اولین پہچان ہے۔اسے کسی مونالیزا یا دریائے سین کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔اب تو آرٹ کے چند دیوانے باقی ہونگے جو مونالیزا کی تصویر دیکھتے ہی پکار اٹھیں کہ ہاں یہ پیرس کی سرزمین پر تخلیق کیا جانے والا شاہکار ہے جس کے سامنے اس کی طلسمی مسکراہٹ کے دیوانے مبہوت کھڑے رہتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ایفل ٹاور کے ذکر پر ہی لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہاں یہ پیرس ہے.....یہی پیرس ہے.....حقیقتاً ایفل ٹاور کی مقبولیت کا مقدمہ زمانے نے سیاحوں کی حسنِ نظر کی بدولت بہادری سے لڑا اور یوں ایفل ٹاور آج پیرس کی سرزمین پر پیرس کی پہچان کا بیڑا اٹھائے کھڑا ہے اور اپنے خالق کی تخلیق پر دنیا سے دادِ وصول کر رہا ہے۔لہٰذا آتش جواں تھا،ارادے مضبوط تھے اور کوشش یہی تھی کہ سب سے پہلے ایفل ٹاور دیکھیں۔آئی ایم کیو کے دفتر سے نکلنے کے بعد ہم میٹرو اسٹیشن (فرانس میں انڈر گراؤنڈ ٹرین کو میٹرو کہا جاتا ہے) پر کھڑے ایفل ٹاور کو جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ایک طرف بیٹھ کر تین چار نقشوں کو جوڑ کر پیرس کی سیر کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔اور بلاشبہ مقامات کی فہرست میں سب سے اوپر ایفل ٹاور کا نام تھا۔میٹرو کے ذریعے ایفل ٹاور کے نزدیکی اسٹیشن پہنچے۔اسٹیشن سے باہر نکلے تو ٹاور کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ایفل ٹاور کے نزدیک پہنچ کر بھی کسی سے رہنمائی حاصل کرنا اپنے شوق کی اہمیت کو گرانے کے مترادف تھا لہٰذا ہم نے رستہ تو خاک ڈھونڈنا تھا،خود راستے نے ہمیں خاموشی سے گود میں اٹھا کر کسی نہ کسی طرح ایفل ٹاور کے سائے میں لا کھڑا کیا.....

"""" لاکھ کوشش کے باوجود پھر لیٹ ہو گئے۔چار سو نظر دوڑائی،اوپر نیچے دائیں بائیں ڈھونڈا،ہر شخص نظر آیا لیکن کوئی نظر نہ آیا تو بیساکھی کے سہارے انتظار کرتا ہوا نظر نہ آیا۔کتنی ہی مرتبہ ایفل ٹاور کا طوف کر ڈالا،ہر پری چہرے کو گھور گھور کر دیکھا،کئی مرتبہ

شامت آتے آتے بچی، لیکن کسی حسین پری کو بیساکھی کے سہارے کسی پڑ کے سائے میں یا سبزے پر، کسی بنچ پر انتظار کی گھڑیاں گنتے نہ دیکھا۔ ہر طرف سے بے نیل ومرام لوٹے تو سر جھکا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور اسے بے وفا سیاح کو کوستے رہے..... کہ اے خوش نصیب بمع بدنصیب و بے وفا سیاح! اے سیاحوں کے مستنصرؔ! تجھے تو کوئی ملا تھا، تیرا اچھا نصیب تھا.....تو نے سوچا کہ سفر میں تو لوگ ملتے ہی رہتے ہیں.....تو نے قدر نہ کی..... یاروں کی فطرت کے برعکس اگر تو وقت پر ایفل ٹاور کی پرچھائیوں میں پہنچ جاتا تو آج تیری کہانی میں کچھ اور حسین یادیں شامل ہوتیں.....کچھ اور ہنسی کھیلتی، مسکراتی، چنچل اور شرارتی داستانیں ہوتیں..... جب مستنصر کے اس کارنامے کو پڑھا تو بہتک وسا.....اتنا کوسا کہ اپنی آخرت غارت کرنے کا سہرا ہمیں اپنے ہی سر نظر آیا''''

اس دن سے لے کر آج تک یہی سوچا تھا کہ ہم بھی پیرس میں ایک آدھ پاسکل ڈھونڈ نکالیں گے اور اسے ایفل ٹاور پر وقت دے کر وقت سے پہلے پہنچ جائیں گے اور اچھے پاکستانی ہونے کی ایک عظیم الشان مثال قائم کریں گے۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آن پہنچا .....ہر طرف حسین وجمیل پری چہرے تھے.....اگر نہ تھا تو کوئی بیساکھی کے سہارے انتظار کرتا ہوا انسان نہ تھا.....کسی کی زندگی بھری آنکھوں میں اچانک مل جانے والی محبت اور خوش قسمتی کے ستارے نہ جھلملا رہے تھے.....ہاں پیرس کی گلیاں اور خاک چھانتی ہوئی ایک بے قرار پرچھائی تھی.....ایک ایسے سیاح کی پرچھائی..... جو عین جنگ کے زمانے میں افغانستان کی سرد سیاہ راتوں میں ٹوٹی پھوٹی شکستہ دیواروں کی پناہ میں کمبل اوڑھے ٹھٹھرتا تھا اور چنگھاڑتے ہوئے ٹرکوں اور بسوں پر سفر کرتا تھا یا یورپ کے کسی ملک میں سڑک کنارے انگوٹھا دکھا کر کسی ٹرک ڈرائیور یا کسی نئے نئے رومانوی جوڑے کی گاڑی میں لفٹ لے کر ان کی محبت بھری پرائیویسی میں دخل انداز ہوتا تھا اور بیروت میں گولیوں کے ڈر سے چیختا ہوا عمارتوں میں چھپتا پھرتا تھا اور انہیں طلسمی کہانیوں کی بدولت وہ خود اور اس کے سفر کا ایک ایک لمحہ بلاشبہ بہت خوبصورت تھا ہمیشہ چاہنے کے قابل اور یاد رکھے جانے کے لائق.....وہ پرچھائی شاید اب تک ایفل ٹاور پر لوگوں کی بھیڑ میں پاسکل کو تلاش کرتی پھرتی تھی.....لیکن صرف وہ سایہ وہ پرچھائی ہی نہیں..... یہاں تو ہر شخص پاسکل کو تلاش کرتا نظر آتا تھا.....کوئی مسافر، کوئی سیاح یا کوئی مزدور، کوئی مصور، گویّا، چیزیں بیچنے والا یا پرندوں، کھلونوں سے کھیلنے والا کوئی گول مٹول بچہ..... ہر کوئی پاسکل کو ڈھونڈتا دکھائی دیتا تھا.....

پاسکل.....شاید یہ ایک بے نام اور بے جسم حقیقت تھی جس کا دنیا میں کوئی مادی وجود نہ تھا اور جو اپنے وجود کی شکل اپنے بنانے والے پر چھوڑ دیتی تھی جسے مستنصر نے کھوج لگانے والوں کو مزید الجھانے کی خاطر پاسکل کا نام دے دیا تھا.....جبکہ اس کا اصل نام ''قسمت'' تھا.....''بلاشبہ مستنصر کی پاسکل بہت اچھی تھی''.....

ہم ایفل ٹاور کے نیچے موجود تھے.....ایفل ٹاور پر چڑھنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ موسم گرم تھا.....ٹکٹ خریدنے کا کوئی سودا دکھائی نہ دیتا تھا.....خیال آیا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اتنی بھیڑ سے ایک نہیں تو سترہ بار باہر نکال دیئے جائیں

گے.....آخر ہم بھی مسلمان ہیں.....سپہ سالاروں کی طرح اٹھارہواں حملہ کریں گے.....لیکن یہ نوبت ہی نہ آئی اور ہمیں تھوڑی سی دھکم پیل، دھینگا مشتی اور قطار میں کھڑے امیدواروں کی کھری کھری تعریفیں سننے کے بعد ٹکٹ مل گیا.....ایفل ٹاور کی غالباً تین منزلیں ہیں جہاں سیاح کیبل کار کے ذریعے جا سکتے ہیں۔ ہر منزل پر سیاحوں کی تفریح کے لئے مختلف سامان موجود ہیں۔ان میں ہوٹل، دکانیں، بار، دفاتر سب شامل ہیں۔ پندرہ فرانک کا ٹکٹ لے کر اوپر پہنچے تو ہر طرف دوربینیں پکڑے پیرس دیکھنے والوں کی بھیڑ نظر آئی۔ یہاں کافی بار، گفٹ شاپس اور کھانے پینے کی دکانیں موجود تھیں۔ دوسری طرف تاحدِ نگاہ پیرس ہی پیرس پھیلا ہوا تھا۔ یہ خوبصورت تاریخی شہر اپنی تمام تر حشر سامانوں کیساتھ ہمارے سامنے عیاں تھا۔ جی بھر کر دیکھا اور شہر کے خوبصورت فضائی مناظر کو آنکھوں کے رستے دل و دماغ میں اتار کر محفوظ کر لیا۔ایفل ٹاور کی مقبولیت اور یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد اس قدر ہے کہ ذاتی قیاس کے مطابق اس سے حاصل ہونے والا منافع ایک طرف اور پیرس کے باقی سیاحتی مقامات سے حاصل ہونے والی آمدنی دوسری طرف، ایفل ٹاور سب پر بھاری نظر آتا ہے۔ دریائے سین نزدیک تھا جس میں رنگ برنگی کشتیاں مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پیرس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے کئی سہولیات میسر ہیں.....انتخاب کا حق سیاح کو حاصل ہے.....ٹرام، میٹرو، بس، کشتیاں، ٹیکسیاں، ہر سہولت کا اپنا مزہ ہے۔ پیرس چونکہ ایک تاریخی شہر ہے اور یہاں تاریخ قدم قدم پہ سر اٹھائے کھڑی دکھائی دیتی ہیں، اسے پیدل گھوم کر دیکھنے میں بھی بہت لطف آتا ہے اور سیاحوں کو بہت سے قابلِ دید مقامات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سڑک کنارے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ریستوران اور ان ریستورانوں کے باہر بچھی رنگ برنگی کرسیاں، ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے طرح طرح کے سیاح، شرارتیں کرتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیاں، رات کو کلبوں اور ڈسکو کو جاتے ہوئے ناچتے گاتے گروہ، چوک میں لگے خوبصورت فوارے، گھوڑوں اور تاریخی شخصیات کے مجسمے، اور ان جیسی کئی خوبصورت جگہیں.....

ذکر ایفل ٹاور کا چلا تھا.....ایفل ٹاور کو گوسٹیو ایفل نامی انجینیئر نے 1889 میں ڈیزائین کیا تھا۔ جب ایفل ٹاور کے ڈیزائین کو تین سو سے زیادہ پیش کئے گئے منصوبوں میں سے منتخب کیا گیا تھا تو اس دیوہیکل مجسمے کو کھڑا کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔اس کے علاوہ لوہے کے اس اونچے ڈھانچے کا کوئی خاص مصرف بھی نظر نہ آتا تھا جو شروع شروع میں ایک نمائش کے طور پر تعمیر کیا جانا تھا۔اس کی تعمیر میں کئی رکاوٹیں بھی آئیں اور کئی مرتبہ اسے گرانے کے خیالات بھی پیش کئے گئے۔ بعدازاں اس کو ٹی وی انٹینا اور ریڈیو انٹینا کے طور بھی استعمال کیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس عجیب و غریب ٹاور کی مقبولیت بڑھتی گئی اور پورے فرانس سے سیاح ٹاور کی سیر کو آنے لگے۔ حکومت نے سیاحوں کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایفل ٹاور پر چڑھنے کی ٹکٹ لگا دی۔ ٹاور کی شہرت فرانس سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی اور دوسرے ملکوں سے بھی سیاح ایفل ٹاور دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ایک دن ایسا آیا کہ پیرس جیسا صدیوں پرانا شہر، لوہے کے اس ڈھانچے سے پہچانا جانے لگا۔اور اب تو پیرس کی شناخت ہی ایفل ٹاور

ہے۔مقبولیت کا یہ راستہ ایفل ٹاور نے ثابت قدمی کے ساتھ آہستہ آہستہ طے کیا۔کئی مرتبہ اسے گرانے کے بارے میں سوچا گیا لیکن حالات اور زمانے نے ایفل ٹاور کی شناخت کا مقدمہ ثابت قدمی سے لڑا اور یوں یہ ہزاروں ٹن لوہے کا یہ بھدا کھمبا آج تک سر اٹھائے کھڑا ہے اور دنیا دور سے اسے دیکھنے آ رہی ہے اور پورے فرانس کو اس پر فخر ہے.....

ایفل ٹاور سے اترنے کے بعد تھوڑی دیر یونہی گھومتے رہے۔پیدل چلنے والوں کے لئے بنی چھوٹی سڑکوں پر تصویریں بنانے والے آرٹسٹ، کھلونے بیچنے والے، اور ایفل ٹاور کے نیچے چیزیں بیچنے والے بکثرت نظر آئے۔کئی پاکستانی، ہندوستانی اور سیاہ فام افراد ایفل ٹاور کی شکل والے کی رنگ،ٹھنڈے مشروبات، اور دیگر اشیاء فروخت کرتے دکھائی دیئے۔اپنے ہم وطنوں کو اس طرح محنت مزدوری کرتے دیکھ کر دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔ایک ہم یہاں سیر و تفریح کی خاطر آزاد اور فکرِ معاش سے عارضی طور پر بے نیاز گھوم رہے تھے اور ایک یہ اپنے ہم وطن جن کی نجانے کیا کیا مجبوریاں ہوں گی غیر ملک میں خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔بلا شبہ رزق اور قسمت خدا طے کرتا ہے۔اس کی رضا میں سب راضی ہیں۔چیزیں بیچنے والے کئی کالوں سے اردو سن کر حیرت ہوئی۔یہ کالے آسان اردو روانی سے بول رہے تھے اور پاکستانیوں کی دلچسپیوں کا سامان بنتے تھے۔پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہیں چیزیں بیچنے والے پاکستانیوں سے مستقل میل جول رکھنے کی بدولت یہ لوگ ایک دوسرے کی زبان سہولت اور دوستی کی وجہ سے جلد سیکھ جاتے ہیں اور سیاحوں کو لبھانے کا ایک اور گر حاصل کر لیتے ہیں۔ایک کالے سے ایفل ٹاور کی شکل والا چابی کا چھلا خریدا جو پاکستان ساتھ لے آئے۔عرصہ ہوا چابی کا وہ چھلا کہیں کھو گیا اور ایسے لگا جیسے پیرس، خاص طور پر ایفل ٹاور ہم سے روٹھ گیا لہٰذا دل میں امنگیں پھر مچل رہی ہیں کہ ایفل ٹاور کو منانے کے لئے دوبارہ فرانس کا سفر اختیار کریں لیکن یہ فیصلہ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔آتش اب بھی جوان ہے۔

.....

پیرس کا ایک وسیع القلب میزبان

خوشیوں بھرا دن ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے رنگینیوں بھری رات کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ دور افق میں ڈوبتے ہوئے سورج کی پیلی روشنی کہیں اَن دیکھے جزیروں اور خطوں میں نئی صبح کا پیغام دے رہی تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا اور پیرس کی رات ایک قاتل حسینہ کی طرح بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہونے کو تھی اور سیاحوں کا دل لبھانے کو بے تاب نظر آتی تھی۔ ایفل ٹاور سے نکلے تو اردگرد کی روشنیوں میں کھو گئے۔ پورا دن ایفل ٹاور پر گزار کر سیاح اب اپنے ہوٹلوں، ریستورانوں اور ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے۔ ایفل ٹاور تمام رات رنگ برنگی روشنیوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔ ایسے میں پیرس کی راتیں جاگتی ہیں۔ لوگ نائٹ کلبوں، ڈسکوز، بارز میں جا کر ناچتے ہیں، بیئر پیتے ہیں اور خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔ اوپیرا عروج پر ہوتا ہے۔ پیرس کے تمام اوپیرا ہاؤس فل ہوتے ہیں۔ روشن سڑکوں کے کنارے اور ریستورانوں کے باہر پڑی کرسیوں پر لوگ چاند کی سحر انگیز روشنی میں پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور خوشیوں کے جام چھلکاتے ہیں۔ ''دریائے سین'' میں رنگ برنگ قمقموں میں ڈولتی ہوئی کشتیاں اور ان پر بنے ریستوران سیاح کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ چھوٹے جہازوں پر بنے ہوئے اوپن ائیر ہوٹلوں میں لوگ دعوتیں اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں پیرس پریوں کا دیس لگتا ہے۔ جہاں خوشیوں کے پتنگے ہوا کے دوش پر پورے شہر میں اڑتے پھرتے ہیں اور رات کی مستی میں نہائے ہوئے رنگ برنگے پھول ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں پر مست ہو کر رقص کرتے ہیں اور پیرس کو معطر رکھتے ہیں۔ لوگ انجوائے کرتے ہیں، سیاح خنک رات میں سڑکوں پر گھومتے ہیں اور جگمگ کرتی دکانوں سے شاپنگ کرتے ہیں۔ کتنی ہی دیر ہم بھی پیرس کی سحر انگیز رات کا لطف اٹھاتے رہے.....واپسی اب دوبارہ ادارہ منہاج القرآن کے دفتر جانا تھا۔ جہاں محمد نعیم صاحب جو کہ ہمارے میزبان تھے ہمارے منتظر ہوتے.....ان کے ساتھ نو بجے کا وقت طے ہوا تھا اور ہم پاکستان میں نہیں پیرس میں تھے جہاں ہمیں وقت کی ہر صورت میں پابندی کرنی تھی.....ورنہ پیرس ہوتا.....ہم ہوتے.....اور پیرس کی طویل جادوئی رات ہوتی.....اور ہم فاقہ حال سیاح ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں پر تازہ اور نوخیز کلیوں کی مانند تمام رات نشے میں بدمست رقص کرتے رہتے.....یعنی کہ سردی میں ٹھٹھرتے رہتے.....چنانچہ وقت پر ٹرین پکڑنے کے لئے میٹرو اسٹیشن جا پہنچے۔ مطلوبہ ٹرین کے ذریعے ادارے کے نزدیکی اسٹیشن پر پہنچے.....اسٹیشن ویران اور سائیں سائیں کر رہا تھا.....ہمارے علاوہ کوئی ذی روح ٹرین سے نہ اتری تھی.....اردگرد کوئی جاندار دکھائی نہ دیتا تھا.....زینے اتر کر سڑک پر آئے اور یاداشت کے مطابق دن والے راستے پر چل پڑے.....ادارے کے دفتر پہنچے تو باہر تالا پڑا تھا.....اعظم صاحب دن کو ہی تاکید کر گئے تھے کہ انہیں کسی جگہ کام سے جانا ہے اور وہ رات بھر دفتر میں موجود نہ ہونگے لہٰذا ہم بروقت پہنچ کر نعیم صاحب

سے مل لیں۔گھڑی دیکھی تو سوا نو بج رہے تھے۔ہمیں کچھ خاص دیر نہ ہوئی تھی.....اصولاً نعیم صاحب کو یہیں موجود ہونا چاہئے تھا لیکن دور دور تک ان کا کوئی نام ونشان نہ تھا.....جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا سردی میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا.....تمام ساز و سامان اندر دفتر میں پڑا تھا جبکہ دن کو ہم کوئی خاص تیاری کر کے آوارہ گردی پر نہ نکلے تھے.....نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ واپسی پر ایسی صورتحال سے واسطہ پڑ سکتا ہے لہٰذا کانپنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا سو یہی عمل بخوبی انجام دینے لگے.....یہ مضافات کا علاقہ تھا جہاں اسٹور روم، گودام اور بڑے گیراج بنے ہوئے تھے۔خالی سڑک پر دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آتا تھا.....موبائل فون، فون کارڈ کچھ بھی جیب میں موجود نہ تھا.....مایوسی کے عالم میں قریب پڑے گتے کی بڑی بڑی پیٹیوں کو اٹھا کر انہیں پھاڑ کر زمین پر بچھا دیا۔پھر خود دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے.....شہر یہاں سے دور تھا اور پیرس جیسے شہر میں اس وقت سستی ترین پناہ گاہ ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا جبکہ پہلے سے ہم ذہنی طور پر اس کے لئے تیار بھی نہ تھے.....یاد آیا کہ نعیم صاحب کا فون نمبر اعظم صاحب دے گئے تھے.....امید کی کرن دکھائی دی تو جھٹ اٹھے اور ارد گرد فون بوتھ ڈھونڈنے لگے.....پیرس میں سکوں والے فون بوتھ کم ہوتے ہیں .....چلتے چلتے چوک میں پہنچے جس کے ایک طرف چھوٹا سا ڈسکو بار اور دوسری طرف میکڈونلڈ تھا.....میکڈونلڈ کے سامنے دو فون بوتھ نظر آئے جہاں تین چار لوگ فون کرتے دکھائی دے رہے تھے.....نزدیک پہنچے تو انکشاف ہوا کہ ہم وطن ہیں.....ایسے لگا کہ ہم جنت میں پہنچ گئے ہیں.....یہ چار پاکستانی نوجوان تھے جو تمام دن محنت مزدوری کے بعد اب اپنے اپنے گھروں کو فون کر رہے تھے.....جان میں جان آئی.....علیک سلیک کے بعد ہم نے بتایا کہ آج ہی پیرس میں آمد ہوئی ہے اور اس وقت یہ مسئلہ درپیش ہے.....انہوں نے نعیم صاحب کا فون نمبر دریافت کیا.....اور فون ملانے لگے.....نعیم صاحب کے فون اٹھاتے ہی ریسیور ہمیں پکڑا دیا.....

ارے جناب.....سلام دعا کے بعد وہ پوچھنے لگے.....نو بجے کا وقت طے ہوا تھا.....آپ کا بہت انتظار کیا .....آپ نہیں آئے..... مجھے کسی ضروری کام سے جانا تھا لہٰذا اب تو میں اس علاقے دور کسی دوست کے ہاں موجود ہوں.....

ہم نے پہلے تو تھوڑا سا شرمندہ ہونا اپنا فرض سمجھا.....پھر بتایا کہ محترم! ہم عین نو بجے میٹرو اسٹیشن جبکہ سوا نو کے قریب ادارے کی عمارت کے باہر موجود تھے.....لیکن وہاں تو کوئی دکھائی نہیں دیا.....

حیرت ہے.....وہ کہنے لگے.....پھر پوچھا اب آپ کی گھڑی پر کیا وقت ہو رہا ہے.....

ہم نے وقت دیکھ کر بتایا.....گیارہ بج رہے تھے.....

اوہو.....یہ کہہ کر نعیم صاحب مسکرا پڑے.....پھر پوچھنے لگے.....یہ بتائیے پیرس پہنچ کر مقامی وقت سے گھڑی ملائی تھی.....

ہم ہونق بنے کبھی گھڑی کو اور کبھی ان چار پاکستانی نوجوانوں کو دیکھنے لگے جو ہمارے ارد گرد کھڑے ایسے کان لگائے ہوئے تھے جیسے کسی سہیلی کے سیال جی کا فون آیا ہو اور سکھیاں محبت بھری باتیں اپنے کانوں سے سننے کے لئے بے تاب ہوں.....

نہیں.....ہم نے جواب دیا.....یہ تو ہمیں کسی نے بتایا ہی نہ تھا.....بلکہ خیال ہی نہ آیا.....

نعیم صاحب پھر مسکرا پڑے.....آپ جب نو بجے مقررہ جگہ پر پہنچے تو اس وقت پیرس میں دس بج رہے تھے جبکہ اِس وقت بارہ بج رہے ہیں.....پیرس اور انگلینڈ میں ایک گھنٹے کا فرق ہے.....یہاں آپ سے غلطی ہوئی.....چلیں آپ وہیں ادارے کی عمارت کے پاس پہنچیں میں پندرہ منٹ میں پہنچتا ہوں.....

فون رکھتے ہی ہم نے گہرا اطمینان بھرا سانس لیا.....یہ وہ غلطی تھی جو دوپہر کو ہم سے سرزد ہوئی اور جس کا ذکر آئی ایم کیو کے دفتر سے باہر نکلتے ہوئے بھی کیا تھا کہ ''یہاں ہم سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی جس کا خمیازہ ہمیں واپسی پر بھگتنا پڑا''.....ہم مقامی وقت کے مطابق گھڑی درست کرنا بھول گئے تھے جس کا نتیجہ دو ڈھائی گھنٹے انتظار کی صورت میں نکلا.....لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ یہ انتظار ذہنی کوفت کا باعث بنا بلکہ انتظار کی اس کیفیت اور رات کے اس سحر زدہ ماحول کا ایک منفرد لطف تھا.....رات کی طویل خاموشی میں ایسے لگ رہا تھا کہ ویران پیرس اور اس کی سوئی ہوئی سڑکوں پر صرف ہماری ذات ہے.....جیسے پیرس رات کی تنہائی میں صرف اور صرف ہمارے لئے ہے.....یہ رات مزید لمبی ہوتی.....اور انتظار مزید طویل ہوتا تو ہمیں پیرس کے ساتھ تنہائی اور رات کی خاموشی کا لطف اٹھانے کا اور موقع نصیب ہوتا.....نعیم صاحب تھوڑی ہی دیر بعد آن پہنچے.....ان کے ساتھ ان کے گھر چلے.....بتانے لگے کہ ایک دن پہلے ہی تحریکِ منہاج القرآن کے بانی طاہر القادری ان کے یہاں ہفتہ بھر قیام کے بعد واپس گئے ہیں.....نعیم صاحب میزبانی کو خوش قسمتی تصور کرتے تھے.....ان کی مہمان نوازی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ہمارے چار دن پیرس کے قیام کے دوران انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی.....ہم ان کے لئے آج سے پہلے بالکل اجنبی اور وہ ہمارے محسن تھے۔انہوں نے نہایت محبت،خوشی اور خوش اسلوبی کے ساتھ میزبانی کی.....جو تمام زندگی ہمیں یاد رہے گی۔یوں پیرس کی سیر میں اگر نعیم صاحب کا ساتھ شامل نہ ہوتا تو شاید ہماری یادیں اتنی حسین نہ ہوتیں اور ہم اطمینان سے پیرس نہ گھوم سکتے .....نعیم صاحب کی میزبانی اور وسیع القلبی کو سلام.....

.....

جنگی قلعے سے جنگی یادگار تک

رات بڑے سکون میں گزری.....ناشتہ نعیم صاحب کے ہاں سے کیا اور نعیم صاحب ہی کی گاڑی میں ہم پیرس شہر آئے.....نعیم صاحب کا گھر بھی مضافات میں واقع تھا جس کے نزدیک سے بہت سی ریل کی پٹڑیاں گزرتی تھیں.....ساتھ ہی فٹ بال کا ایک گراؤنڈ تھا اور اس پرسکون رہائشی علاقے میں امن ہی امن تھا۔شہر کے شور شرابے سے دور، یہ رہنے کے لئے ایک آئیڈیل جگہ تھی۔نعیم صاحب کا شہر میں ایک بڑا جنرل اسٹور تھا۔وہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ شہر کی طرف نکلے تو ہم بھی ان کے ساتھ ہو لئے.....ان کی دکان سے جدا ہونے کے بعد اب ہم اکیلے تھے۔پیرس تھا۔پیرس کی رنگینیاں.....فرانسیسیوں کی انگریزی سے نفرت اور سڑکوں پر دکھائی دیتے ان گنت رنگ برنگ سیاح تھے.....

سب سے پہلے ہم جس جگہ پہنچے وہ غالباً کوئی تاریخی جیل یا جنگی قلعہ تھا.....اس کا نام تا حال ذہن سے محو ہے.....بے حد وسیع قلعہ نما عمارے کے باہر پانچ سے دس فٹ چوڑی خندق کھدی ہوئی تھی۔سامنے وسیع سڑکیں اور پکے میدان تھے۔خندقوں سے عمارت کی چار دیواری تک لگ بھگ پانچ سو میٹر کا فاصلہ تھا اور یہاں خوبصورت گھاس اگی ہوئی تھی۔کئی افراد قلعے کے بڑے دروازے سے اندر باہر جا رہے تھے۔قلعے میں داخل ہوئے تو ہر طرف بھانت بھانت کے لوگ عمارت کی راہداریوں اور وسیع پکے صحن کے گرد بنے ہوئے بنچوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئے.....اس کے علاوہ صحن کے چاروں کونوں میں بڑی بڑی کالی توپیں نصب تھیں۔صحن کراس کے کے دوسری جانب شمالی راہداری میں کھانے پینے کی دکانیں اور سووینئیر شاپس تھیں۔اس کے علاوہ ایک بڑے سے ہال میں جنگی ساز و سامان سجا نظر آ رہا تھا۔ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔اس عمارت کے عقبی جانب بڑے بڑے ہرے بھرے میدان اور خوبصورت ہری بھری باڑیں لگی ہوئی تھیں..... یہاں ہم نے دو گھنٹے گزار دیئے..... ہر طرف گھوم کر باہر نکلے تو سیدھے کھلے میدانوں کی طرف چل پڑے۔یہ راستہ درائے سین کی طرف جاتا تھا۔اس راستے میں ایک جنگی یادگار آرک دی ٹرائمفور (Arc de triamphore) اور ایک خوبصورت شیشے کی محراب آتی تھی۔

''آرک دی ٹرائمفور'' (Arc de triamphore) ایک دو مستعطیل نما موٹے ستونوں پر طرح کھڑی عمارت تھی جس پر مختلف طریقوں سے اشکال اور عبارات کندہ کی گئی تھیں۔پہ چلا کہ یہ عمارت دوسری جنگِ عظیم میں جان دینے والے اور اس کے علاوہ دیگر فرانسیسی سپاہیوں کی یاد میں تعمیر کی گئی ہے۔ایسی ہی ایک عمارت اب انڈیانے بھی اپنے سپاہیوں کی یاد میں تعمیر کی ہے ۔آرک دی ٹرائمفور (Arc de triamphore) کے گرد گول دائرے میں خوبصورت فرش بنا ہوا تھا۔پتہ چلا کہ سال کے

کسی مخصوص دن یہاں پر با قاعدہ پریڈ ہوتی ہے اور فوجی دستے بھی تعینات کئے جاتے ہیں۔ یہاں مستقل طور پر ایک مخصوص حصہ میں آگ جلتی رہتی ہے جو بیسیوں سال سے بغیر بجھے جل رہی ہے اور کسی لمحے بھی یہ آگ بجھائی نہیں گئی.....یہیں سے پیرس کی ایک معروف شاہراہ ''شانزالیزے'' نکلتی ہے۔اس کے علاوہ اگر مشرق کی جانب جائیں تو پانچ منٹ کی واک کے بعد دریائے سین آجاتا ہے جس پر ایک لمبا اور خوبصورت پل بنا ہے۔ نیچے وسیع دریا (River sene) بہتا ہے..... دریا کے دونوں کناروں پر سڑکیں ہیں۔ جہاں تیز ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔پُل شروع ہونے کے ساتھ ہی جنوبی طرف چند سیڑھیاں نیچے چلی جاتی ہیں۔ جہاں ایک تنگ سا دروازہ ہے۔دروازے سے اندر داخل ہوں تو نہایت آراستہ و پیراستہ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن آپ کے سامنے ہوتا ہے۔ یہ اسٹیشن دیکھنے کے بعد ہم واپس اوپر پل پر چلے آئے۔

تین بجنے والے تھے۔موسم خوشگوار تھا۔ ہمارا پیٹ مزید آوارگی کے لئے انرجی سپلائی کرنے سے معذور تھا اور ایندھن مانگتا تھا۔ ہمارے پاس بریڈ، جام اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ہم نے پل کے دونوں طرف بنی چھوٹی دیوار پر بیٹھ کر پیٹ پوجا کی بلکہ آدھا گھنٹہ وہیں لیٹ کر آرام کیا۔ یہاں سے دوسری طرف پیرس شہر خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ پل سے نیچے گہرائی میں سڑک پر رواں دواں ٹریفک اور دریا میں چلتی سیاحوں کو سیر کرواتی خوبصورت کشتیاں نہایت بھلی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ دوپہر ہمارے سفر کی ایک خوبصورت ترین دوپہر تھی۔ یہاں سے ہم اپنی اگلی منزل کو روانہ ہوئے.....

.....

پیرس دیکھ کر بھی نہ دیکھا

''سیکرے کور'' شہر کے وسط میں دریائے سین کے نزدیک ایک پہاڑی پر واقع تاریخی چرچ ہے۔جس پہاڑی پر یہ چرچ واقع ہے اس کا نام ''نٹ مرٹری'' بتایا جاتا ہے۔اونچائی پر واقع چرچ تک پہنچنے کے لئے دو تین راستے موجود ہیں۔سیڑھیوں کے علاوہ کیبل کار کے ذریعے بھی اوپر پہنچا جا سکتا ہے۔رومن طرزِ تعمیر پر بنائے گئے اس چرچ کی تعمیر کا آغاز 1876 کے اوائل میں ہوا۔275 فٹ بلند اس چرچ کی تعمیر 1914 میں مکمل ہوئی۔سینکڑوں کی تعداد میں ٹیڑھے میڑھے زینے طے کر اوپر پہنچے تو سامنے ایک نئی دنیا آباد تھی۔چرچ کو چھوڑ کر ہم بلندی سے پیرس شہر کی رعنائیوں کا نظارہ کرنے لگے۔پیرس اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ سامنے جلوہ افروز تھا اور ہم جی بھر کر اس کی تاریخی و جدید عمارتوں کے فضائی نظارے سے لطف اٹھا سکتے تھے۔ایک طرف ''سین'' نفاست کے ساتھ بہتا ہوا نظر آ رہا تھا تو دوسری طرف ''ایفل ٹاور'' چھاتی تانے،اونچا قد نکالے پورے پیرس میں منفرد اور نمایاں نظر آتا تھا۔چرچ کے اردگرد بیسیوں آرٹسٹ رنگ برنگے برش،بورڈ اور اسٹول لئے بیٹھے تھے اور سیاحوں کو طرح طرح کے لالچ دے کر تصویر بنوانے کے لئے اکسا رہے تھے۔یہ آرٹسٹ بیس سے پچیس منٹ میں آپ کو سامنے بٹھا کر تصویر بنا دیتے ہیں۔تصویر کی قسم اور پوز کا انتخاب خود آپ پر منحصر ہے۔پہاڑی پر چڑھنے سے پہلے اور سیڑھیاں چڑھنے کے دوران اکثر تصویر بنانے والے،بیسیوں طرز کے میوزک بجانے والے اور خوبصورت کافی شاپس اور ریسٹورنٹ دکھائی دیتے ہیں۔جہاں سیاح مزے دار دھوپ میں کرسیوں پر نیم دراز موسم سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں یا کھانے کی مزیوں کے گرد ہنستے کھیلتے پیٹ پوجا کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔فضا میں ان کے ٹھٹھوں کی آوازیں بلند ہو رہی ہوتی ہیں اور ہوا میں قہقہے حسین رنگ بکھیر رہے ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اردگرد بیٹھے میوزک بجانے والوں کی موسیقی کی مترنم دھنیں سیاح کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور آدمی کئی لمحوں تک مبہوت ہو کر اس خوبصورت لمحے کے جادو میں کھو جاتا ہے۔یہی سفر کا مزا ہے کہ عام سی چیز میں بھی کشش محسوس ہوتی ہے اور ماحول میں موجود اردگرد کی مختلف چیزوں کا امتزاج سیاح کے لئے جنتِ کافر کا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔چرچ کے گرد سیاحوں کو سیر کروانے کے لئے کھلی چھت والی ایک لمبی سی کھلونا نما گاڑی نظر آ رہی تھی۔بلاشبہ یہ بھاری جیب والوں کی سواری تھی۔اپنے یہاں تو استطاعت ہوتے ہوئے بھی ایسی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا من نہیں کرتا تھا۔چرچ میں داخلہ مفت تھا۔لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر جیسے تیسے کر کے اندر پہنچے۔چرچ میں کئی میزیں دھری تھیں جن پر دھیمی دھیمی روشنی والے دیے جل رہے تھے۔دیا جلانے کا نذرانہ محض ایک فرانک تھا۔یار لوگ اگر دل چاہیں تو مفت اٹھا کر بھی دیے کو لو دکھا سکتے ہیں۔لوگ اپنے پیاروں کے نام کا ایک ایک دیا جلاتے ہیں۔سیاح اپنے سفر کی یاداشت کے طور پر دیا جلاتے ہیں۔ایک دیا ہم نے بھی جلایا اور اپنے سفر اور اس خوبصورت شہر ''پیرس'' کے نام کیا کہ.....

اے تاریخ کے سیاہ وسفید ورق!.....

خوبصورتی اور محبت کی علامت!.....

محبت کرنے والوں کے آنگن!.....

خوشبوؤں کے شہر!.....

سیاحوں کے خواب!.....

تو سلامت رہے ہمیشہ اور اسی طرح سب کا دل لبھاتا رہے.....

تیری خوبصورتی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہے.....

اور تیری فضاؤں میں ہمیشہ پیار محبت کی تانیں رقص کرتی رہیں.....

اور تیری فضاؤں میں قیامت تک رنگ برنگی روشنیوں کے قمقمے بکھرتے رہیں.....

یہ شہر بھی کیا ہوتے ہیں، زمین کے بے جان خطے، پانیوں کی گزرگاہیں، یہ اپنی تاریخ خود کیسے بناتے ہیں؟..... یہ تو زمانہ ہوتا ہے جوان کی تاریخ طے کرتا ہے؟..... یہ تو نصیب کی بات ہے..... کسی شہر کو نپولین میسر آتا ہے تو کسی کو ہٹلر اور پھر انہیں شہروں کو ایفل ٹاور اور دیوارِ برلن ملتی ہے۔ کہیں چرچل، کہیں واشنگٹن، کہیں نیرو .....کہیں اکبرو جہانگیر تو کسی شہر کو اورنگ زیب اور علی ہجویریؒ..... یہ تو شہروں کا نصیب ہے کہ انہیں کس زمانے میں کیسے کیسے لوگ نصیب ہوتے ہیں..... چرچ کے باہر نیچے تک زینے بنے ہوئے تھے جن کے ارد گرد سبزے کا خوشنما قالین بچھا ہوا تھا۔ سورج نکلا ہوا تھا۔ زینوں پر بیٹھے، ستاتے، آرام کرتے، گپیں ہانکتے لوگ موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چرچ اس قدر اونچائی پر تھا کہ قریب سے اس کی پوری تصویر لینا ناممکن تھا۔ زینوں کے ذریعے نیچے جا کر پورے چرچ کی تصویر اتاری اور واپسی پر اوپر کی جانب آتے ہوئے لوگوں پر نظر پڑی تو کئی گوریاں کھلم کھلا بیٹھی نظر آئیں۔ ہمارے ذہن میں اس سے زیادہ کوئی تأثر نہ ابھرا کہ گورے لوگ ہیں..... آزاد ہیں..... جو چاہے کریں اور جو چاہیں پہنیں..... یا..... جو چاہیں نہ پہنیں..... لیکن ہمارے ملک کے ایک عظیم آوارہ گرد سیاح جسے دنیا ''مستنصر حسین تارڑ کے نام سے یاد کرتی ہے'' کے ایک سفرنامے میں اسی چرچ کے حوالے سے کچھ تفصیل پہلے ہی نظر سے گزر چکی تھی کہ ان زینوں پر پیشہ ور عورتیں ٹولیوں کی صورت ایسے انداز میں بیٹھی ہوتی ہیں کہ لوگ ان کو بھرپور طریقے سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دیکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس سفرنامے میں ایفل ٹاور، شانزالیزے اور دیگر مقامات کے حوالے سے کئی اہم باتیں پڑھنے کو ملیں اور اسی وجہ سے اپنے اس سفر کا مزہ دوبالا کیا تین بالا ہو گیا..... اسی سفرنامے نے ہمیں پاسکل کے سحر میں مبتلا کیا..... پھر ہم نے ''لا پیرس'' بھی پڑھا تھا..... قمر علی عباسی کے اس سفرنامے کا خیال آیا تو ایسے لگا اپنا سفر تو ان سیاحوں کے سامنے کچھ بھی نہیں، کہ ہم نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ ہم تو ''لا پیرس'' پڑھ کر پیرس آنے سے پہلے ہی

یہاں کی خوب سیر کر چکے تھے۔اگر چہ اپنا سفر تو پیرس نہ دیکھنے کے مترادف تھا۔ لیجئے اختر مونکا کو تو ہم بھول گئے.....ہم پاکستان میں ہی موجود تھے جب ان کی آوارہ گردیوں اور شرارتوں کی داستان پڑھی.....موصوف ہمیں مانٹی کارلو تو لے گئے۔وہاں کی خوب سیر بھی کروائی۔ساحلِ سمندر کی رنگینیاں بھی دکھائیں لیکن پیرس آتے ہوئے محض 205 کلومیٹر کے فاصلے پر ایکسیڈنٹ کروا بیٹھے اور یوں ان کے خوبصورت سفر میں شریکِ سفر ہم ان کے قارئین نہایت بھنائے کہ اتنی مشکل سے پہاڑوں پر، سمندروں میں، زمین پر ہر جگہ ساتھ دیا لیکن جو پیرس دیکھنے کے لئے شروع سے چلے تھے وہاں تک پہنچنے سے پہلے پہلے ایکسیڈنٹ کروالیا اور ہم مفلسوں کو ناحق انتظار کروایا لیکن ''پیرس دوسو پانچ کلومیٹر دور'' پڑھنے کے بعد مصمم ارادہ کرلیا کہ اب کے فرانس جا کر پیرس گئے یا نہ گئے، مانٹی کارلو تو ضرور ہو کر آئیں گے اور اس کا سارا ثواب اپنے اختر مونکا کے سر ہوگا کہ انہیں کا سفر نامہ اس شوق کا موجب بنتا چلا جا رہا ہے.....مانٹی کارلو تو اب پھر کبھی پر چھوڑ دیا تھا.....فی الوقت پیرس ہمارے شکنجے میں تھا.....

''سکرے کور'' نامی س چرچ کا رنگ سفید ہے جو اسے دیگر عمارتوں اور گرجا گھروں سے سے ممتاز کرتا ہے اور اس کی شہرت اور پہچان کی علامت ہے۔ چرچ کے ارد گرد گھومے، ایک عجیب طرز کا شخص کالا لباس پہنے اسٹول پر کھڑا اور ٹیپ ریکارڈر آن کئے بھیک مانگنے کا جدید انداز اپنائے ہوئے تھا۔ایک پیاری سی جاپانی لڑکی اسٹول پر خوبصورت انداز میں بیٹھی، اپنی تصویر بنوانے میں محو تھی۔ایک بانسری نواز تھا جو فضا کو اپنی مدھر دھنوں سے نواز رہا تھا۔ایک طرف بیسیوں سیاح ریسٹورنٹ کے باہر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔واپسی پر ہم بھی چرچ کے سامنے والی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور ستانے لگے۔خلافِ معمول آسمان صاف تھا اور سورج آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔سفر نامے کے آغاز میں بھی ذکر کیا تھا کہ جس دن موسم گرم ہو، آسمان صاف ہو تو بارش کے مارے ہوئے ان گوروں کے لئے یہ گرم دن عید کے دن کی مانند ہوتا ہے۔اس دن یہ لوگ اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ خوشی کے مارے سب کچھ پہننا بھول جاتے ہیں۔کچھ دیر گزری تو ہم نے واپسی کی راہ اختیار کی۔کیبل کار کی بجائے سیڑھیوں سے ہی واپس نیچے اترنے کو ترجیح دی۔سفر میں سہولت کے حصول کی خواہش فطری سیاح کی فطرت کے برعکس ہوتی ہے۔ہم جیسے سیاحوں کے پاس محدود وقت ہوتا ہے جس میں اپنے آس پاس زیادہ سے زیادہ گھوم لینے کی خواہش ہوتی ہے لہٰذا وقت بچانے والی ان سہولتوں کی بجائے ہم تھوڑا سا وقت دے کر ادھر ادھر ہر جگہ کا مشاہدہ کرنا اور دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔نیچے اترے تو ہر طرف آرٹسٹ بیٹھے نظر آئے، ایک طرف سڑک کے ارد گرد بازار لگا تھا۔ہر دکان سے سیل سیل کی آوازیں فرانسیسی زبان میں بلند ہو رہی تھیں۔کسی ملک میں کسی بھی دکان سے کوئی دکاندار یا ٹیپ ریکارڈر تیز تیز آواز میں کچھ کہہ رہا ہو اور دکان کے اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو.....پھر وہاں بھانت بھانت کی عورتوں کا ہجوم لگا ہو، جو جلدی جلدی چیزوں کو پٹخ پٹخ کر سیل سے اچھی چیز نکال رہی ہوں، اور خواہ آپ اس زبان سے نابلد ہی کیوں نہ ہوں.....تو سمجھ جایئے کہ سیل سیل کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ان صداؤں نے ہمیں بھی آخر کار لبھا ہی لیا اور ہم بھی ایک دکان کی طرف لپک پڑے۔گھنٹے آدھے گھنٹے بعد بہت سی

دکانیں اور سٹال چھان لینے کے بعد واپسی کی راہ لی۔ ہم نے وہاں سے کیا کچھ خریدا، یہ نہ بتانا، بتانے سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ بتانے اور نہ بتانے کے درمیان کچھ بھی نہیں آتا.....

.....

یہ صرف اپنے وطن کا اثاثہ نہیں

پیرس میں آئے دو روز ہو چلے تھے۔ جانی انجانی کئی جگہوں کی سیر کر چکے تھے۔ پیرس کی سیر اس لحاظ سے مشکل ثابت ہوتی ہے کہ یہاں ایک تو انگلش ناپید ہے دوسرا پیرس کی شناخت کے طور پر زیادہ تر ایفل ٹاور اور مونالیزا کی تصویر پیش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے دور بیٹھے لوگ یہاں کے دیگر تاریخی وثقافتی مقامات کو لندن کے مقابلے میں زیادہ نہیں جانتے۔ پیرس کے بارے میں لکھی گئی کتابوں سے معلومات حاصل کر کے اور پیرس کی جگہوں کی تاریخ پہلے سے جان کر پیرس دیکھنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ لندن کی شہرت میں مومی عجائب خانہ، ہائیڈ پارک، بکنگھم پیلس، ٹن ڈاؤننگ اسٹریٹ، دریائے ٹیمز پر تعمیر شدہ ٹاور برج، لندن کے سائنسی وآرٹ میوزیمز کا کردار خاص طور پر اہم ہے..... جس سے دیگر دنیا کسی نہ کسی حد تک واقف ہے۔ ہماری کتابوں میں بھی پیرس کے مقابلے میں لندن کے سفرناموں اور مضمونوں کو فوقیت دی گئی ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ پیرس ایک رومانٹک شہر ہے، خوشبوؤں کا شہر ہے، محبت کرنے والوں کا شہر ہے، پیار کرنے والوں کا آنگن ہے اور حقیقتاً ایسا ہے۔ پیرس کے نام میں ایک عجیب سا جادو ہے۔ دلفریبی ہے، خوش آویزی ہے، یہ نام اپنی طرف کھینچتا ہے جبکہ لندن کے نام سے ایک رعب و دبدبے کا احساس ہوتا۔ عجیب سا وزن ہے اس نام میں، کھچاؤ ہے۔ ان دو دنوں میں فرانسیسیوں کی انگریزی سے بیزاری کے بھی دو چار تجربات ہو چکے تھے۔ لندن میں گھومنے پھرنے کے دوران سیاہ فام افراد اکثر نظر آتے ہیں جبکہ پیرس میں کالوں کا تناسب کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا۔ یہاں جو کالے نظر آئے، محنت مزدوری کرتے نظر آئے، چھابڑیاں لگائے، محنت مزدوری کرتے یا سیاحتی مقامات پر اشیاء بیچتے نظر آئے۔ ان میں سے اکثر سیاہ فام افریقی باشندے ہوتے ہیں۔ جو اپنے ملکوں سے یہاں اچھے روزگار کی تلاش میں آتے ہیں۔ پیرس کو چھوڑ کر اگر برطانیہ، امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کو دیکھا جائے تو کالوں کی تعداد نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے۔ امریکہ برطانیہ میں تو سیاہ فام افراد کی ایک الگ شناخت ہے۔ اب ان کو بھی معاشرے میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ائرپورٹ کے کاؤنٹرز پر، ٹرین اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر، پولیس اسٹیشنوں میں، اور دیگر مقامات پر بھی کالے کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان ممالک کی کھیلوں کی تمام ٹیموں میں کالوں کی نمائندگی گوروں کے برابر نظر آتی ہے۔ پیرس میں اکثر کالے غریب علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان کے علاقوں میں کوئی مقامی گورا چلا جائے تو خود کو غیر ملکی سمجھنے لگ پڑتا ہے۔ اسی طرح کالے کئی غیر قانونی کاروبار بھی کرتے ہیں۔ جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ پبلک مقامات پر اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ اکثر حکومت کو پریشان کرتے ہیں۔ کالوں کی طرف سے ہمیشہ احتجاج بلند ہوتا رہتا ہے کہ حکومت نسل پرستی کرتی ہے، انہیں ملازمتوں اور سہولتوں میں برابر حقوق نہیں دیے جاتے.....

لندن کے بعد اب پیرس میں بھی ایک بات ہم نے خاص طور پر نوٹ کی۔ یہ وہ اکا دکا فقیر تھے جو پبلک مقامات پر کہیں کہیں بیٹھے نظر آ جاتے تھے۔ تعداد زیادہ ہو تو بھی احساس ہو لیکن لندن پیرس ایسے شہروں میں ایک دو افراد بھی بہت نظر آتے ہیں اور کسی بھی سیاح کی توجہ آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ ابھی تک ہم صرف برِصغیر کو ہی فقیروں اور گداگروں کی جاگیر سمجھتے تھے کہ یہ صرف ہماری سرزمین ہی کے بیش قیمت اثاثے ہیں لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ یہ شوق یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ چلتے چلتے اب ان گداؤں اور غم نواؤں کی کچھ اقسام پر ہی غور و خوز ہو

جائے، چلئے وطنِ عزیز سے کچھ موازنہ ہی سہی.....

ایک صاحب ہیں، میلی میلی سی نیوی بلیو کلر کی پینٹ ہے جو بیلٹ ہونے کے باوجود سر بسجود ہونے کو ہے، انڈر گراؤنڈ یا میٹرو اسٹیشن کی اندرونی سیڑھیوں کے آخر میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، حالت دگرگوں نظر آتی ہیں، ہوش حواس ایسے کھوئے ہیں کہ اللہ معاف کرے بہت پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ سامنے ایک ادھڑی ادھڑی سی لال ٹوپی دھری ہے اور آتے جاتے لوگوں کو اداس نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ زبان گنگ ہے۔ نظروں میں پیغامِ انسانیت موجود ہے۔ بال بکھرے بکھرے ہیں جن کی موصوف کو کچھ پرواہ نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاتھ میں گٹار لئے بیٹھے ہوں اور خانہ بدوشوں والے دلگداز گیتوں کی دھن پر نہ صرف خود سر ہلا ہلا کر محظوظ ہو رہے ہوں بلکہ راہ چلنے والوں کو بھی مفت میں مستفید کرتے ہوں۔ اور پھر چند خدا ترس لوگ ہیں جو سرخ ٹوپی میں ہدیہ پیش کرتے جا رہے ہیں اور جناب ہدیہ و عطیہ سے بے نیاز سر دھننے اور گٹار پر انگلیاں چلانے میں مصروف ہیں۔ بات یہیں تک ہوتی تو ٹھیک تھا۔

ایک اور صاحب فرانس کے ایک اونچے گرجا گھر کے سامنے، لکڑی کا اسٹول دھرے اس پر کھڑے ہیں۔ قد کاٹھ اونچا نکالا ہے۔ صحت بھی ورزشی جسم سے اچھی محسوس ہوتی ہے۔ سر سے پاؤں تک کالے کپڑے سے خود کو ڈھانپا ہوا ہے جسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے تو

سب کالا ہی کالا نظر آتا ہے۔ منہ بھی کالے کپڑے میں چھپا ہے یوں سمجھئے دن دیہاڑے سرِ عام روپوشی اختیار کر رکھی ہے۔ زمین سے چار پانچ فٹ اونچے کھڑے ہوتے ہوئے بھی انڈر گراؤنڈ ہونے کی سی کیفیت اپنائی ہوئی ہے۔ اسٹول کی ٹانگوں میں پڑا ایک ٹیپ ریکارڈر جناب کی مجبوریوں اور ضرورتوں کی تعداد گنوا رہا ہے۔ ساتھ میں ٹین کا ایک سبز ڈبہ پڑا ہے۔ (رنگ کی کوئی قید نہیں، آپ سرخ و سفید بھی منتخب کر سکتے ہیں)۔ لوگ ارد گرد کھڑے ہیں اور ان کی مفلسی کا بھاشن سن رہے ہیں۔ کچھ غم والم سے رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور کنجوسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چند سکے اور روپے ڈبے میں ڈالتے جاتے ہیں۔ بات یہاں تک بھی ہوتی تو ٹھیک تھا۔ صاحبِ ٹیپ ریکارڈر کے نخرے ان کے قد کی طرح اتنے بلند ہیں کہ کوئی سیاح ان کے ساتھ کھڑے ہو کر مفت تصویر نہیں اتروا سکتا۔ اگر جناب محترم کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوانے کی سعادت حاصل کرنی ہو تو پہلے کچھ ہدیہ سبز ڈبے کی

نذر کریں اور پھر شوق سے جتنے چاہے فوٹو جس مرضی پوز میں اتروائیں۔کبھی کبھی یہ تعداد محدود بھی ہوسکتی ہے۔یہ سب ہدیے کی صوابدید پر ہے۔

آخری صاحب کی کہانی کچھ یوں ہے۔کسی بس اسٹیشن یا انڈر گراؤنڈ ٹرین اسٹیشن کے فرش پر چادر بچھائے یا اس تکلف سے بھی بے نیاز ہوکر پرمحوِ استراحت نظر آتے ہیں۔ان صاحب نے بھی اپنی ایک لال سی ٹوپی سامنے رکھ چھوڑی ہے۔لیکن اس کے ساتھ نہ کوئی گٹار ہے نہ کسی ٹیپ ریکارڈر سے ''گاڈ کے نام پر دے دو بابا'' یا ''یسوع مسیح کی قسم ہفتوں سے بھوکا ہوں مدد کرو'' یا'' بھیک مانگنا میرا شوق نہیں، نہ ہی اس بدبخت پیشے کو میں پسند کرتا ہوں بس اتفاقاً اس حالت کو آن پہنچا ہوں'' یا اسی سے ملتا جلتا کوئی نوحہ نہیں چل رہا بلکہ ٹوپی کے ساتھ شراب کی دو عدد خالی بوتلیں دھری ہیں۔صاحبِ اسباب کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ہوش حواس تو ویسے ہی نہیں رہے آنکھیں بھی نیم کھلی ہیں۔بس صورتِ حال سے یہی فریاد ٹپک رہی ہے کہ خدا کی قسم کب سے پیاسا ہوں۔خدا کے خداترس بندوں دل کھول کر ہدیہ دیتے جاؤ.....وغیرہ وغیرہ.....

لہٰذا ہماری یہ سوچ کہ یورپ میں فقیر نہیں ہوتے غلطی پر مبنی تھی۔ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو بڑے ہی دلچسپ ہوتے ہیں۔اپنے پیارے تو ایسے ہوتے ہیں کہ فقیر کی زبان سے بھی انگلش فرانسیسی سن کر مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتے کہ بھائی بھیک بھی انگلش میں مانگتا ہے۔اپنے وطن کی تو بات ہی اور ہے۔یہاں تو یہ ''شوق'' کیا ہونا، باقاعدہ ایک منافع بخش پیشہ ہے۔ان کو بچپن سے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔تربیت میں بھی مختلف مراحل شامل ہوتے ہیں۔جتنا تجربہ بڑھتا جائے گا اتنا منافع بڑھتا جائے گا۔قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت میں فرق تو خیر کیا کرنا یہاں تو صرف لینا ہی لینا ہے۔خرچ کیا کچھ نہیں اور نفع آیا ہزاروں میں.....اپنے یہاں گلی، محلے، بازار، سڑکیں، پل، پبلک پارک اور چوک وغیرہ سب فقیروں اور گداگروں میں تقسیم کئے ہوتے ہیں۔کوئی بھولے بھٹکے سے کسی کے ایریا میں داخل ہوا کہ دوسری طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ آئی، خوب تماشہ لگا۔ایک دوسرے کی امیری غریبی کے تمام کچے چٹھے کھول کر رکھ دئے کہ موصوف شام ڈھلے گھر جا کر سونی کمپنی کے اکیس انچ ٹی وی پر پڑوسی ملک کے یہ یہ سیریل دیکھتے ہیں اور دن بھر کی محنت کے بعد سکون سے آرام فرماتے ہیں۔شہر میں اتنے مکان اور اتنے اڈے ہیں اور اس بینک میں اتنا لاکھوں ہزاروں روپیہ جمع ہے وغیرہ وغیرہ.....پیشہ ور گداگر عورتوں کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔یہیں کوئی لڑائی جھگڑے کا ماحول بنا کہ گود میں پڑا پرسکون بچہ پاس میں پٹخا، لنگوٹ کسا، اور ایک دوسرے کو سر سے پاؤں تک ننگا کر دیا۔خدا معاف کرے ہمیں تو لکھتے ہوئے بھی ڈر آتا ہے۔اللہ سب کو ایسی حالت سے بچائے.....ایک اندھے فقیر کو جب صاحبِ استطاعت شخص پیسے دینے لگا تو سکہ ساتھ میں لڑھک گیا، اندھے فقیر نے اچک کر سکہ اٹھایا اور پوٹلی میں گم کر لیا۔وہ شخص جو اندھے ہونے کی بنا پر ترس کھا کر ہدیہ دے رہا تھا پریشان ہوگیا پوچھنے لگا بھائی آپ تو اندھے ہوکر مانگ رہے ہو یہ سکہ کیونکر نظر آیا.....فقیر موصوف کہنے لگتے ہیں کہ جناب! بہت معذرت میں اصل

فقیر نہیں ہو دراصل وہ میرا دوست ہے جو یہاں بیٹھتا ہے اور وہ آج سینما دیکھنے گیا ہے۔اس کا کاروبار ٹھپ نہ ہو یہی سوچ کر میں اس کی جگہ بیٹھا ہوں.....

''کوئی ہم نوا ہو تو گلستاں کا کاروبار چلے''

اگلی دفعہ یہاں آئے تو ان فقیروں کو دیکھنے کی بجائے ان کی ایمانداری اور دیانتداری کا مشاہدہ کریں گے۔

.....

بھٹکے ہم پیرس میں

پیرس میں بھٹک جانے کو کس کا دل نہیں چاہتا.....کچھ تو وہ لوگ ہیں جو ہر سال عین بہار کے موقع پر پیرس پہنچ جاتے ہیں۔اور کچھ ہم جیسے آوارہ گرد جو یہاں پہنچنے کے لئے اپنی خواہشوں کے مکمل ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں.....ہم نے ان دو دنوں میں پیرس میں بہت کچھ دیکھا۔آج ہمیں اس خوبصورت شہر میں تیسرا دن تھا.....

ہم بذریعہ انڈر گراؤنڈ (Metro) پیرس کے اس صدیوں پرانے چرچ ''نوٹروڈیم'' (Notre Dem) پہنچے.....چرچ کی دو تین منزلہ عمارت کے سامنے سبزے کی خوبصورت باڑیں لگی ہوئی تھیں۔مٹیالے رنگ کے اس چرچ کے دائیں بائیں دو چوڑے مینار تھے۔درمیانی محراب میں گول گھڑی نما دائرے بنے ہوئے تھے۔چرچ کے اندر باہر آنے کی کھلی اجازت تھی۔چرچ کا ایک حصہ زیرِ تعمیر تھا۔اس چرچ پر ایک یادگار فلم ''ہنچ بیک آف دی نوٹی ڈیم "Hunch Back Of The Notr Dam" بھی بن چکی ہے۔یہ چرچ حکومتی فیصلوں،میٹنگز اور دیگر شاہی وسیاسی مقاصد کی خاطر تین چار صدیوں قبل تعمیر کیا گیا تھا۔

ہم بھی دیگر افراد کی طرح چرچ کے اندر داخل ہو گئے۔چرچ کے اندر روشندانوں کے طور پر خوبصورت اور رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔دو بڑے دروازوں میں ایک داخلی اور دوسری خارجی مقصد کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔لوگ چرچ میں ایک ایک فرانک کی موم بتی حاصل کر کے اور تیل کے دیئے خرید کر اپنے اپنے پیاروں اور یسوع مسیح کے نام روشن کر رہے تھے۔چند لوگ آرام کرنے کے لئے لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔چرچ میں چند لمحے گزارنے کے بعد اور لوگوں کو عقیدت سے چرچ کا احترام کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد ہم واپس باہر چلے آئے اور اپنی اگلی منزل کے لئے میٹرو اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے.....میٹرو میں داخل ہونے کے لئے آپ کو مشین میں سے اپنی ٹکٹ گزارنی پڑتی ہے.....ہم نے بیگ میں سے اپنی ٹکٹ نکالنا چاہی تو بیگ غائب تھا.....ادھر ادھر بہتیرا تلاش کیا لیکن بیگ غائب تھا.....ہم نے نعیم صاحب کو فون کر کے فوراً اس غیر اتفاقی صورتِ حال کی اطلاع دی۔اس بیگ میں تمام کرنسی سمیت ہماری بس،فیری،جہاز کی ٹکٹیں،فون نمبرز کی کاپیاں،یاروں دوستوں کے اَتے پتے اور بیسیوں ایسی اہم چیزیں تھیں جن کے بغیر ہم ادھورے تھے۔سب سے بڑھ کر اس بیگ میں ہمارا پاسپورٹ تھا.....لیکن بیگ اب غائب ہو چکا تھا.....پریشانی کے عالم میں ہمیں انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کے کاؤنٹر پر ایک ایشیائی لڑکی کھڑی نظر آئی.....

ہم نے اپنی تمام پریشانی اسے جا بتائی.....وہ انڈیا سے تعلق رکھتی تھی اور یہاں ملازمت کرتی تھی.....اس نے ہمیں بتایا کہ اسٹیشن سے باہر نکل کر سڑک کنارے ایک پاکستانی کا بڑا جنرل اسٹور ہے.....آپ وہاں چلے جائیں.....اس کے علاوہ اس نے فون کارڈ خریدنے اور اسٹیشن انتظامیہ کے پاس ہماری شکایت درج کروانے میں مدد دی۔.....اسٹیشن سے نکل کر ہم ڈھونڈتے

ہوئے اس جنرل اسٹور تک پہنچے.....وہاں دو پٹھان افراد نظر آ رہے تھے.....انہوں نے ہمارے اس حادثے کے بارے میں سنا تو پریشان ہو گئے.....نعیم صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ سبز رنگ کا بیگ گھر اور دوکان پر بھی نہیں ہے، ہمارے کہنے پر انہوں نے پاکستانی ایمبیسی میں بیگ سمیت پاسپورٹ گمشدگی کی رپورٹ کر دی.....

تین بج رہے تھے اور ہم پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر بھٹک رہے تھے.....ان دو پاکستانیوں میں سے ایک شخص نے پولیس آفس کا پتہ دریافت کیا اور ایک ٹیکسی والے کو ایڈریس سمجھا کر ہمیں پولیس آفس بھیج دیا.....وہاں پہنچے تو انہوں نے رپورٹ درج کرنے سے انکار کر دیا.....ان کا کہنا تھا کہ ہم اپنے پاکستانی ہونے کا ثبوت لے کر آئیں.....اب ہمارے پاس ہمارر عمرے کے بعد گنج شدہ چہرے کے علاوہ کوئی پاکستانی ثبوت نہیں تھا.....انہوں نے کہا کہ جب تک پاکستانی سفارت خانہ یہ یقین دہانی نہ کروادے کہ آپ پاکستانی ہیں، تب تک رپورٹ درج نہیں ہو سکتی.....

ہم نے نعیم صاحب سے دوبارہ رابطہ کیا.....انہوں نے ٹیکسی لے کر فوراً دکان پر آنے کو کہا.....ہدایات کے مطابق ہم دکان پر پہنچے.....اس نقصان کے اوپر سب سے بڑی مشکل یہ کہ آج ہی شام ہماری بس کے ذریعے واپسی لندن کی ٹکٹیں کنفرم تھیں.....ہم نعیم صاحب کے ساتھ سب سے پہلے بس اسٹیشن کی طرف نکلے اور اپنی ٹکٹیں کینسل کروائیں.....یہ بھی خبر نہ تھی کہ پاسپورٹ کب ملے لہٰذا ہم آگے کسی تاریخ کی ٹکٹ بک بھی نہ کروا سکتے تھے۔اس کے علاوہ مزید مشکل یہ تھی کہ ہماری تین دن بعد بذریعہ ہوائی جہاز لندن سے جدہ کی ٹکٹ بھی کنفرم تھی.....آسمان سے گرے.....بادلوں میں اٹکے.....وہاں سے کھجور اور پھر کھجور سے گر کر ہم پورے کے پورے زمین میں بلکہ دلدل میں دھنس چکے تھے اور اپنے آپ کو بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے.....

کہاں ہم پیرس میں تین دن کی سیر کا پروگرام بنا کر آئے تھے اور کہاں ہمیں مزید دو دن رکنا پڑ گیا.....نعیم صاحب نے تشویش ظاہر کی کہ اگر وہ تمام نئے اور پرانے پاسپورٹس جن پر پیرس سے آگے بھی آٹھ ملکوں کے تازہ ویزے لگے ہوئے تھے.....کسی بے رحم پاکستانی کے ہاتھ لگ گئے تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے اور ہم نعیم صاحب کو فوراً ان کے خدشے کی تردید کرنے کو کہتے تھے کہ ہمیں واپس اپنے وطن جانا تھا.....پیرس کی سرزمین اتنی بھی دلفریب نہ تھی کہ ہم اس کے عشق میں خاک آلودہ پڑے رہ کر وہیں لوٹنیاں مارتے رہنے پر راضی رہتے.....بہرِ حال کسی نہ کسی طرح ہمیں سفارت خانے سے یہ نوید سنائی گئی کہ جیسے ہی کوئی گمشدہ پاسپورٹ ''بازیاب'' ہوئے یا کرائے گئے تو نعیم صاحب کے گھر یا موبائل فون پر اطلاع کر دی جائی گی.....لوٹ کے بدھو گھر کو آئے کے مصداق ہم پھر منہ اٹھائے واپس نعیم صاحب کے گھر ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے.....

دل میں ہزاروں طرح کے خدشات جنم لے رہے تھے.....پیرس نے ہماری محبت کا جواب اس صورتِ حال سے پالا پڑوا کر دیا تھا.....رات کو سوتے ہوئے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی.....سب سے بڑی مشکل لندن سے آگے فلائٹ تھی۔کیونکہ پیرس سے لندن واپسی پر ہمیں لندن سے آگے برمنگھم اور پھر واپس لندن آنا تھا.....اور اس سارے آنے جانے کے لئے اب کوئی

وقت نہ بچا تھا.....نجانے رات کے کس پہر نیند نے ہمیں اپنی بانہوں میں لے کر سلا دیا.....

صبح سویرے نعیم صاحب دکان پر چلے گئے .....ہم بھی ان کے ہمراہ ایک پریشان جانور کی طرح بلکہ قربانی کے جانور کی طرح مارے مارے پھر رہے تھے۔دس بجے ایمبیسی سے فون آیا کہ چند پاسپورٹ ملے ہیں.....ہم آ کر دیکھ جائیں..... یہ خبر ہمارے لئے خوشیوں کی نوید تھی..... بھاگم بھاگ سفارت خانے پہنچے.....اندرون شہر ایک اونچی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر پاکستانی سفارت خانہ تھا.....وہاں سفارت خانے کے عملے نے ہماری بات توجہ سے سنی.....اچھی طرح ہماری شناخت اور جانچ پڑتال کی گئی.....جو پاسپورٹ ملے تھے وہ ایک بیگ میں تھے.....یعنی کہ وہ سبز رنگ کا بیگ، وہ خوشیوں کا پروانہ، وہ وطن واپسی کا کھلا اجازت نامہ، وہ پاسپورٹس، وہ مسرتیں، وہ چاہتیں، وہ دوستیاں، وہ تمام رنگینیاں، اور وہ یادیں جو ہم نے اس بیگ میں سنبھال کر رکھی تھیں.....ہماری ہی تھیں.....اور شاید..... ہمیشہ رہیں گی۔

(ختم شد)

وقار مسعود خان

wakkar.masood@gmail.com

اردو زبان و ادب کو
دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچایئے
یہ کتاب
کسی دوست کو ای میل کیجئے

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کام

اس قسم کے بڑی فائلیں کسی کو بھیجنے کا آسان طریقہ
www.ifrendz.com/upload
بڑی سے بڑی فائل بھیجئے۔۔۔منٹوں میں
بھیجنے والا بھی خوش۔۔۔۔پانے والا بھی خوش